Rs. 50/-

اکتوبر، نومبر ۲۰۱۹ء

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

حیاتِ نو

جریدہ

دہلی

خصوصی اشاعت

اسلام اور مستشرقین

جامعۃ الصفہ ورنگل

دیشائی پیٹ روڈ، ورنگل (تلنگانہ)

دعوت دین واقامت دین کیلئے ایک تعلیمی تحریک

الحمدللہ جامعۃ الصفہ ورنگل اپنے مقاصد کی تکمیل کا جہاں سولہواں سال مکمل کررہا ہے، وہیں پر تحریکی حلقوں میں بھی ایک معروف منفرد ادارے کی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ 2005 تا 2018 کے عرصے میں بفضلہ تعالیٰ 86 طلباء حفظ القرآن کی تکمیل کرچکے ہیں۔ جب کہ گذشتہ چھ برسوں میں 12 طلباء دستار فضیلت سے سرفراز ہوکر تحریک اسلامی کی سعی وجہد میں اپنا عملی کردار نبھارہے ہیں۔

جامعہ کے شعبہ عالمیت میں چار سالہ اور فضیلت کا دوسالہ کورس رکھا گیا ہے، جس میں تشنگان علم وخادمان دین اپنے علم کی پیاس بجھارہے ہیں تاکہ معاشرے میں وہ اپنا منصبی فریضہ ادا کرسکیں۔ کوشش کی جارہی ہے کہ فارغین جامعہ میں دین کی صحیح فکر، اقامت دین کی تڑپ، عصری علوم سے اتنی واقفیت، مہارت، بصیرت پیدا کی جائے کہ وہ زمانے کے ہر چیلنج کا مطلوبہ اسلوب میں مقابلہ کرسکیں۔ جامعہ میں اس وقت ریاست تلنگانہ وآندھراپردیش کے مختلف اضلاع کے علاوہ دیگر کچھ مقامات کے طلباء بھی زیر تعلیم ہیں اور تقریباً سارے ہی طلباء دارالاقامہ میں مقیم ہیں۔ ان کی رہائش، طعام وتعلیم کے اخراجات اہل خیر حضرات کے تعاون وسرپرستی میں مکمل کئے جاتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطائے فرمائے) طلباء کو انگریزی وعلاقائی زبان تلگو بھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ وہ برادران وطن میں دعوت دین کا کام انجام دے سکیں۔ اس کے علاوہ جامعہ میں کمپیوٹر لیاب بھی موجود ہے۔ انشاءاللہ جامعہ کی دوسری منزل کی تعمیر اسی سال پیش نظر ہے۔ ادارے کا ماہانہ خرچ -/2,20,000 روپے ہے۔ سالانہ اخراجات اور تعمیر کیلئے ادارہ دردمندان ملت کے بہی خواہان تحریک سے دست تعاون کی امید بھی رکھتا ہے۔

نوٹ: کاکتیہ یونیورسٹی اور دیگر کالجوں میں اعلیٰ عصری علوم کے لئے شہر ورنگل آنے والے طلباء کی دینی واخلاقی تربیت اور بہتر رہائش کے علاوہ حصول تعلیم میں یکسوئی کے پیش نظر جامعۃ الصفہ کے ہاسٹل میں رہائش کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ چنانچہ جامعہ کے ہاسٹل میں پروفیشنل کورس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء مقیم ہیں۔ الحمدللہ اس کے اچھے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

تعاون کی شکلیں : شعبہ حفظ وعالمیت کے طلباء کی کفالت کیلئے سالانہ فی طالب علم -/20,000 ہزار روپے ہے۔ اساتذہ وغیر تدریسی عملہ کی تنخواہوں کیلئے ماہانہ -/95,000 روپے اس کے علاوہ اور دیگر ضروریات۔۔۔۔

بانی وناظم جامعہ محمد خواجہ عارف الدین

پیغام عمل

طلباء کی ذہنی وفکری تربیت اور عملی جدوجہد کیلئے ناظم جامعہ جناب محمد خواجہ عارف الدین کی بعد نماز عشاء روزآنہ کی گئی فکری واصلاحی تقریروں کے مجموعے "پیغام عمل" (کتابی شکل) کو عام طور پر تحریکی حلقے میں کافی پسند کیا گیا ہے چنانچہ اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کردیا گیا ہے۔ جامعۃ الصفہ کے علاوہ مکتبہ اسلامی سب ڈپو مچھلی بازار، حیدرآباد سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (قیمت -/150)

JAMIA-TUS-SUFFAH, H.No. 11-24-314, Deshaipet Road, Warangal. (T.S.) India
Phone : +91-870-2424576, Cell: +91-98490 04547,
A/c. No. 444351498, Indian Bank, Mandi Bazar, Warangal. IFSC : IDIB000W004

SUFFAH HIGH SCHOOL

27 YEARS

English Medium, Nursery to X Class

Mandi Bazar, Warangal 506002 (Telangana)

Providing Excellence in Education Since 27 Years

Suffah High School was established in the year 1991 and since 27 years providing excellence in school education. We provide the best infrastructure for the students to get modern education in an islamic environment. Preparing the students for their better future here and hereafter

Our Facilities

- Moral Education
- Play Way Learning
- Arabic Classes
- Digital Class
- Coputer Lab
- Science Lab

Mohd. Khaja Arifuddin
Founder & Chairman

Dr. Aziz Ahmed Ursi
Founder Sec & Correspondent

Contact us @ 91870-2424086, 9700054253 email: suffah.shs@gmail.com

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی　　مدیر اعزازی: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

جلد: ۴،　　شمارہ: ۱۰، ۱۱،　　اکتوبر۔نومبر ۲۰۱۹ء / صفر۔ربیع الاول۔۱۴۴۱ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 8287025094، 9927206518
انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 7011838453
ای میل: jareedahayatenau@gmail.com

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی	علی گڑھ
زبیر ملک فلاحی	لکھنؤ
انیس احمد فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	: اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:	۶۰ روپے
سالانہ زرتعاون	: اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	: اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla,New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

اداریہ	ضیاء الدین فلاحی	۵
قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات	محمد رضی الاسلام ندوی	۹
مستشرقین اور اسلام	ذکی الرحمٰن غازی فلاحی مدنی	۱۵
استشراق اور مستشرقین: آغاز وہدف	محمد اسامہ شعیب	۲۷
قرآن اور مستشرقین	آسیہ خاتون	۴۳
قرآن کے باب میں اہم مستشرقین کا تعارف	محمد انوار القمر	۴۷
تفسیر اور علوم تفسیر پر مستشرقین کی تحقیقات	توثیق کلیم	۵۵
مستشرقین جو بعد میں مسلمان ہوگئے	عاطف سہیل	۶۳
سیرت نبویؐ اور مستشرقین	صفی الرحمٰن نبیل	۶۹
تحریک استشراق اور جدید مفکرین پر اس کے اثرات	ایاز حسام الدین	۷۷
امام زہریؒ اور مستشرقین	محمد عاصم	۸۳
فقہ کے باب میں اہم مستشرقین کا تعارف	محمد عاطف شاداب	۹۳
استشراق کے رد میں نمایاں خدمات	محمد معاذ	۹۸
فقہ اسلامی پر شاخت کے اعتراضات کا جائزہ	خباب شہزاد	۱۰۴
تدوین قرآن اور مستشرقین	اسامہ احسن صدیقی	۱۱۴
حدیث اور مستشرقین	عاطف آصف	۱۱۹
حدیث پر اعتراض کرنے والے مشہور مستشرقین	سعد شمس	۱۳۳
آپ کے خطوط	ظفر احمد الاثری، ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، رضوان احمد فلاحی، ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	۱۳۹
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۱۵۷

مقالہ نگاران و قلمی معاونین

۱- ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی (مدیر حیات نو)

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ziauddin.malik.falahi@gmail.com

۲- ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

رکن مجلس شوریٰ جامعۃ الفلاح، سکریٹری جماعت اسلامی ہند

mrnadvi@gmail.com

۳- مولانا ذکی الرحمٰن غازی مدنی

استاد، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

zakighazi786@gmail.com

۳- ڈاکٹر محمد اسامہ شعیب

گیسٹ فیکلٹی شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

usama9911@gmail.com

۴- آسیہ خاتون

ایم اے، اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی، دہلی

۵- محمد انوار القمر

متعلم عربی چہارم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۶- توثیق کلیم

متعلم عربی چہارم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۷- عاطف سہیل

فضیلت [سال آخر]، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۸- صفی الرحمٰن نبیل

متعلم عربی ششم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۹- ایاز حسام الدین

فضیلت [سال اول] جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۰- محمد عاصم
متعلم عربی ششم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۱- محمد عاطف شاداب
متعلم عربی چہارم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۲- محمد معاذ
فضیلت [سال اول] جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۳- خباب شہزاد
فضیلت [سال اول] جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۴- اسامہ احسن صدیقی
متعلم عربی پنجم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۵- عاطف آصف
فضیلت [سال اول]، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۶- سعد شمس
متعلم عربی پنجم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۷- ظفر احمد الاثری، لندن
asarizafar@hotmail.com

۱۸- ڈاکٹر عبید اقبال عاصم
سکریٹری یوپی رابطہ کمیٹی، علی گڑھ
ubaidiqbalasim@gmail.com

۱۹- رضوان احمد فلاحی، لندن
rizwanfalahi@hotmail.com

۲۰- ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
پروفیسر وصدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
drfahadamu60@yahoo.in

۲۱- مولانا مصباح الباری فلاحی
استاد، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

تحریکِ استشراق اور برصغیر کا دفاعِ اسلام

استشراق(Orientalism) کی جڑیں یہود ونصاریٰ کی اسلام اور مسلم دشمنی میں پیوست ہیں، جس کا پہلا مظاہرہ ساتویں صدی عیسوی میں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان رسالت کے فوراً بعد ہوا تھا۔ یوں تعصب، دجل اور دشنام طرازی میں گندھی ہوئی یہ دشمنی نزول قرآن کے بعد شروع ہوچکی تھی، بعد کی صدیوں میں تعلیم وتحقیق کے نام پر اس نے ایک ہمہ گیر فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ قرآن مجید، اسوۂ رسول اور سیرت صحابہ کے علاوہ سیاسیاتِ اسلام، عمرانیات، اقتصادیاتِ اسلام، اخلاقیات وبشریات اسلام الغرض پوری تراث اسلامی اور تہذیب اسلامی مستشرقین کے حملوں کا محمل بنی رہی ہے۔

بارہویں صدی میں پیٹر دی وینریبل (Peter-The Venerable) پہلا شخص ہے جس نے اس افسوس ناک مہم کا آغاز کیا اور اس سے زیادہ منظّم اور منصوبہ بند کوشش جس شخص نے کی وہ مشہور پادری ریمنڈ لل (Lull) تھا جس نے مغربی دانش گاہوں میں عربی اور علوم اسلامی کی تعلیم کا اجراء کیا۔(۱)

تحریک استشراق کے فروغ میں صلیبی جنگوں میں شریک تمام یورپی ممالک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جن میں فرانس، اٹلی، انگلینڈ، اسپین، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، چیکوسلوا کیا، فن لینڈ اور امریکہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان علاقوں میں ہزاروں محققین، مدرسین، شارحین اور وکلاء نے رسائل ومجلّات، دانش گاہوں اور تحقیقی اداروں کے ذریعہ اسلام اور مسلمان پر رطب ویابس کا طومار باندھ دیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اس صورت حال کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> اور ریسرچ کے معنی ہی تو ان کے ہاں ٹھہر گئے ہیں مسلمات ویقینیات میں شک وشبہ پیدا کرنا اور ان میں رخنے ڈالنا...اس کی بنیاد ضروری نہیں کہ اسلام دشمنی پر ہی ہو۔ یقین کی جگہ بے یقینی، سکون کی جگہ مسلسل بے چینی اور اطمینان کی جگہ بے اطمینانی فرنگی ذہنیت کی سرشت میں داخل ہوچکی ہے اور اس کا اظہار ان کے سارے ہی ''علمی وتحقیقی'' کاروبار میں ہو رہا ہے۔(۲)

ان علاقوں میں چندنہایت اہم تحقیقی ادارے قائم کیے گئے جنھوں نے تحریک استشراق کی بڑھ چڑھ کر خدمت انجام دی۔ مثلاً ۱۸۲۲ء میں سوسائٹی ایشیا ٹک آف پیرس، ۱۸۲۳ء میں رائل ایشیا ٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ، ۱۸۴۲ء میں امریکن اورینٹل سوسائٹی وغیرہ۔ ان تمام اداروں میں قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات کی دریافت، آثار قدیمہ کا مطالعہ، کتابوں کی ایڈیٹنگ، اسلامی مآخذ ومصادر کی ترتیب وتدوین، فہرستوں اور اشاریوں کی ابواب بندی نیز فرہنگ ودائرۃ المعارف کے ڈھیر لگادیے گئے۔

خوش آئند پہلو یہ ہے کہ متعصب مستشرقین کے درمیان چند اعتدال پسند مستشرقین بھی گزرے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ہنری اسٹب (و:۱۶۷۶)(Dr. Henry Stubb)، جن کی کتاب An account of the Rise and Progress of Mohammetanism لندن سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی، سیرت پاک پر معتدل کتاب تصور کی جاتی ہے۔ دوسری طرف مائکل ایچ ہارٹ (پ:۱۹۳۲ء) نے اپنے اعتدال پسندانہ طرزِ تحریر کی بنا پر عالمی شہرت حاصل کی۔ اس طرح کے معتدل مزاج مستشرقین میں سے بعضوں کو ایمان کی دولت بھی نصیب ہوچکی ہے، رسَل ویب (Russel webb)، علامہ محمد اسد (پولینڈ) اور علاء الدین شلبی کو اس قبیل میں شمار کیا جانا چاہیے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کا برصغیر ہندوپاک، تحریک استشراق کا تعاقب کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔ متعدد اامامان تحقیق کے جلو میں سرسید احمد خاںؒ (و:۱۸۸۹ء)، علامہ شبلی نعمانیؒ (و:۱۹۱۴ء)، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (و:۱۹۷۷ء) اور پروفیسر عبدالرحیم قدوائی (پ:۱۹۵۸ء) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان حضرات کی خدمات کا تذکرہ اردو اور انگریزی ادبیات میں استشراقی فکر کے بعض روشن پہلوؤں کی وضاحت کرے گا اور نوجوان محققین کو تحقیق کی طرف مہمیز کرے گا۔ سرولیم میور (و:۱۹۰۵ء) کی کتاب The Life of Muhammad میں رواداری کے نام پر تاریخ دانی کا معاندانہ اپروچ اختیار کیا گیا ہے، جس کا بروقت جواب دے کر سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ عالم کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا۔ ان کی رجحان ساز تصنیف خطبات احمدیہ نے اردو زبان میں سیرت نگاری کی تحریک کا آغاز کیا۔ انھوں نے سیرت نبویؐ کی متعدد جہات کو عقل ونقل کا خوب صورت پیرہن عطا کیا ہے اور تحریک استشراق کے مکائد کی قلعی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید کے مدرستہ العلوم میں جب علامہ شبلی نعمانی عربی کی تعلیم وتدریس کے لیے آئے تو انھوں نے سیرۃ النبیؐ تصنیف کر کے سرسید کے سیرتی منہاجیات کو نہ صرف وسعت بخشی بلکہ عہد وسطیٰ کے مسلم مؤرخین وسیرت نگاران کی تقصیرات،

معاصر وقدیم مستشرقین کی اغلاط اور درایت کے اصول کو نافذ کرکے دنیائے سیرت نگاری میں تاریخی پہچان بنائی۔ تیسری طرف مولانا عبدالماجد دریابادی نے بنیادی طور پر قرآن مجید کا اردو اور انگریزی ترجمہ وتفسیر لکھ کر جو تحقیقی معیار قائم کیا اس کے سامنے استشراقی عمارت زمین بوس ہونے لگی۔ دونوں تفاسیر کے مطالعہ کے ذریعہ مستشرقین کے اسلوبِ تفسیر نگاری پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ مزید برآں مولانا دریابادی نے مستشرقین کے اسلوبِ سیرت نگاری کا پردہ بھی چاک کیا، اس ضمن میں آپ کی بعض تحریریں چشم کشا ہیں۔ مثلاً اسلام حریفوں کی نظر میں (سچ ،۲؍اگست ۱۹۹۶ء)، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، نیا ایڈیشن، (صدق جدید، ۱۲؍دسمبر ۱۹۵۸ء)، اسلام اور مستشرقین پر ایک نظر (صدق جدید، ۲۵؍اکتوبر ۱۹۶۳ء، سچی باتیں (صدق جدید، یکم نومبر ۱۹۶۳ء)، ایک مستشرقانہ اُپج (صدق جدید، ۷؍اکتوبر ۱۹۶۶ء) اور سیرت نبویؐ اور علمائے فرنگ (مشمولہ ما محمد) موخر الذکر مقالے میں متعدد متعصب مستشرقین اور ان کا جواب دینے والے احباب مثلاً امیر علی، اقبال، اور ڈاکٹر حمید اللہ کا احاطہ کرنے کے بعد تبصرہ کرتے ہیں:

> اب بھی مغرب، مغرب ہے، اور مشرق، مشرق، بدزبانیوں کا دور اب ختم ہوچکا ہے، لیکن بدگمانیاں اب بھی دونوں کے درمیان بعدالمشرقین قائم رکھے ہوئے ہیں اور فاضل ایڈیٹروں اور ان کے نامیوں کی کوشش اب تک اسی وضع داری کو نباہے چلی جارہی ہے کہ پیامِ اسلام کی حقانیت، رسول کی صداقت اور کلام مجید کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کا کوئی شائبہ بھی کسی مقالے سے نہ پیدا ہونے پائے اور اس سلسلے کے ہر واقعے کو توڑ مروڑ کر مسخ وتلبیس کے ساتھ پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا جب کتاب بند کرے تو پھر اپنے قلب ودماغ کو اسلام سے دورتر ہی پائے۔ (۳)

حالیہ تین عشروں میں پروفیسر عبدالرحیم قدوائی ڈائریکٹر خلیق احمد نظامی مرکز برائے مطالعات قرآن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے سیرت اور قرآن پر مستشرقین کی خدمات کا بھرپور علمی وتنقیدی جائزہ اردو اور انگریزی زبان میں لیا ہے۔ اور سولہویں تا اکیسویں صدی کے تفسیری اور مسیحی ادبیات سیرت کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے دونوں علمی وتحقیقی منصوبوں اور مطالعات کو مشرق ومغرب میں پذیرائی حاصل ہوچکی ہے۔ جن کی واضح مثال یہ ہے کہ ذیل میں مذکور دوسری کتاب یورپ کے نصف درجن معروف اداروں نے چھاپ کر لاکھوں لوگوں تک پہنچادیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ذیل کی تحقیقات کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا:

۱۔ مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن، مرتبہ پروفیسر اختر الواسع، البلاغ پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۵ء، صفحات: ۱۲۸

۲- Kidwai, Images of the Prophet Muhammad in English Literature (New York, 2018), 152 pages

۳- Bibliography of the Translations of the Meanings of the Glorious Quran into English, 1649,-2002, Madinah Munawwarah, 2005, 496 pages

جمعیۃ الطلبہ، جامعۃ الفلاح کا یک روزہ سمینار بعنوان اسلام اور مستشرقین، منعقدہ ۳۱/اگست ۲۰۱۹ء دراصل ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک خوش آئند مظاہرہ ہے۔ جمعیت کے جملہ کارپردازان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ محدود وسائل اور تعلیمی مصروفیات کے دوران انھوں نے قرآن، سیرت اور فقہ کے حوالے سے مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لیا۔ قارئین، ان مقالات کے تحقیقی معیار کے ضمن میں اپنے قیمتی مشوروں رتبصروں سے ضرور نوازیں تاکہ ''مبتدی محققین'' ان سے مستفیض ہوسکیں یقیناً آج کی مغربی دنیا میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر گفتگو اور بحث ومباحثہ کا ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ امت اسلامی کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ مکالمے اور بین المذاہب مباحثوں کا دروازہ کھولے اور بطور خاص ہندوستان کے برادران وطن کے درمیان سیرت پاک کے حقیقی پیغام کو عام کرنے میں لگ جائے۔ البتہ یہ کام معاصر عہد کی زبانوں میں عبور اور استعداد پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہے! ایسے میں مذکورہ محققین کی تحریریں ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہیں گی!

ضیاءالدین ملک فلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
۲۹/صفرالمظفر ۱۴۴۱ھ/۲۹/اکتوبر ۲۰۱۹ء

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے رجوع کریں: پروفیسر ظفر احمد قریشی، Prophet Muhammad and Hiscrities، لاہور، ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۹۲ء، ج ۱، ص ۳

۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق جدید، لکھنؤ، ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۸

۳۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق جدید، لکھنؤ، ۱۲/دسمبر ۱۹۵۸ء، ص ۴

قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مغرب کے جن محققین نے مشرقی علوم، بہ الفاظ دیگر اسلامیات کے مطالعہ وتحقیق کو اپنا موضوع بنایا ہے، ان میں خامہ فرسائی کی ہے اور علمی خدمات انجام دی ہیں انہیں مستشرقین (Orientalists) اور ان کی مہم جوئی کو استشراق (Orientalism) کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ استشراق کی تحریک اصلاً عیسائیوں اور یہودیوں کی جانب سے صلیبی جنگوں کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین میں سے معدودے چند کو چھوڑ کر سب کے سب عیسائی یا یہودی ہیں۔ صلیبی جنگوں میں پے درپے ہزیمتیں اٹھانے کے بعد اہلِ کلیسا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرا محاذ کھول دیا اور صدیوں تک ایسی کتابیں تصنیف کی جاتی رہیں، جن میں اسلام کو اوہام و خرافات کا مجموعہ، بت پرستی کی دعوت دینے والا، خوں ریز وخوں آشام اور فرسودہ (Out of Date) مذہب اور مسلمانوں کو جاہل اور وحشی قوم کہا جاتا تھا۔ استشراق کی تحریک مختلف مراحل سے گزری ہے۔ علمی تحقیقات کے مواد، اسلوب، انداز پیش کش اور طرز ادا میں بہت کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔ معروضیت اور غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا جانے لگا ہے۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں، مستشرقین کی بنیادی فکر میں، جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا، کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین نے اسلامیات کے میدان میں بعض پہلوؤں سے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ اسلامی مصادر ومراجع پر عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کو دریافت کیا ہے، ان کی فہرست سازی کی ہے، انہیں ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، کئی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مرتب کیا ہے، حدیث کی امہات الکتب کا انڈیکس تیار کیا ہے اور بعض ایسی خدمات انجام دی ہیں جن سے خود مسلمان قاصر رہے، لیکن یہی مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت

محمد ﷺ کے بارے میں اپنی تحریروں میں زہر اگلنے سے نہیں چوکتے۔ جو مستشرقین استشراق کے اس عمومی رنگ سے آزاد رہ سکے ہیں اور ان کی تحقیقات معروضیت اور حقیقت پسندی پر مبنی ہیں ان کی تعداد انتہائی مختصر ہے۔

مستشرقین نے قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام، صحابہ، تابعین، محدثین، فقہاء، صوفیہ اور ائمہ ومجتہدین کی سوانح، فن جرح وتعدیل، اسماء الرجال، حجیت حدیث، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کا ارتقاء اور اس کے مآخذ، غرض اسلامیات کے تمام موضوعات سے تعرض کیا ہے اور ان میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں قرآن کریم سے متعلق ان کے خیالات کا عمومی جائزہ لیا جا رہا ہے۔

مستشرقین عام طور پر قرآن کریم کو الہامی کتاب تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اس کا اس حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں کہ اسے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے تصنیف کیا ہے، چنانچہ وہ بڑی باریکی سے یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے نعوذ باللہ قرآن کریم تصنیف کرنے کے لیے کن مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ مستشرق ٹسڈل (Tisdal) نے 'مآخذ القرآن' کے نام سے ایک کتاب ہی لکھ دی ہے۔ اس کے مطابق آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور ابلیس کے انکار کا قصہ مارسیون (Marcion) کی کتاب سے لیا گیا ہے، آسمانوں اور زمین کے سات طبقات ہونے کا تصور ہندو روایات سے ماخوذ ہے، حوروں کا خیال ایرانی روایات سے لیا گیا ہے، عرش، لوح محفوظ اور میزان وغیرہ کا تصور مصری خرافات سے اخذ کیا گیا ہے، نماز کا طریقہ صابی قوم سے لیا گیا ہے۔ دیگر عبادات کے طریقے یہودی روایات سے مستفاد ہیں۔ بعض قرآنی تعبیرات مشہور جاہلی شاعر امراؤ القیس کے اشعار میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مستشرق بلاشیر (Blachere) کہتا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ واقعات اور یہودی و مسیحی روایات میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) اور عیسائی راہبوں کے درمیان مکہ میں تعلقات استوار تھے۔ مستشرق فلیپ ایرلنگی دعویٰ کرتا ہے کہ مکہ میں محمد (ﷺ) کی اکثر، یہودیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ (بے چارے کو نہیں معلوم کہ یہودی مکہ میں نہیں، بلکہ مدینہ کے اطراف میں رہتے تھے) مستشرق کلیمن ہور (Clement Haurt) انکشاف کرتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات جاہلی شاعر امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سے ماخوذ ہیں۔ بعض مستشرقین

دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نبوت کا اعلان کرنے سے قبل برسوں ایک بڑے مسیحی عالم ورقہ بن نوفل کے پڑوس میں رہے ہیں، جن سے انھوں نے بھر پور استفادہ کیا تھا۔ یہ دعوے اور انکشافات بے سر و پیر کے تخیلات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس انداز تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ بدطینت لوگ علم کے نام پر جو تحقیقات کرتے ہیں اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہ ہر حال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے۔ اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد ﷺ نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فلاں فلاں مقامات سے چرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اس طرز تحقیق میں یہ لوگ اس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھن آنے لگتی ہے اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس پر اور اس تحقیق پر۔'' (سیرت سرور عالمؐ، ۱/۴۷۷)

اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر علاقے میں انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کو بھیجا ہے اور ان پر اپنی طرف سے وحی نازل کی ہے۔ سب سے آخر میں اس کی طرف سے جو وحی حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی وہ قرآن کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں فطرت سلیم بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ قرآنی بیانات کی جو مماثلتیں دیگر کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ وحی الٰہی کے بقایا جات یا فطرت کے اشارے ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کریم کو ہمیشہ اللہ کا کلام کہا، جس کی آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اپنے کلام کو اس سے الگ رکھا۔ آج بھی قرآن کریم اور احادیث نبوی کا مطالعہ کرنے والا دونوں کے درمیان بیّن فرق بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔ اگر قرآن اور حدیث دونوں کا سرچشمہ ایک تھا تو ان کے اسلوب اور اندازِ بیان میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کیا کسی شخص کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی عبقری کیوں نہ ہو، یہ ممکن ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب میں گفتگو کرنے کے بعد اسے اللہ کا کلام قرار دے، پھر اسلوب بدل کر دوسری گفتگو کرے اور اسے اپنا کلام قرار دے۔ اگر قرآن آپ ہی کی تصنیف تھی تو اسے اپنی طرف منسوب کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟

یہاں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے دلائل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ عصرِ حاضر کی سائنسی

تحقیقات نے ان دلائل میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ جن حضرات نے انسان اور مظاہر کائنات کے بارے میں قرآنی بیانات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن کا مصنف کوئی انسان ہو اور وہ بھی ساتویں صدی عیسوی کا، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس موقع پر ڈاکٹر موریس بوکائی کے نتیجۂ بحث کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی مشہور زمانہ کتاب 'قرآن، بائبل اور سائنس' میں لکھتے ہیں:

''قرآن نے جن سائنسی پہلوؤں پر خصوصی بحث کی ہے وہ میرے لیے بہ طور خاص حیرت انگیز ہیں، کیوں کہ قرآن کے یہ بیانات پوری طرح جدید سائنسی نظریات کے مطابق ہیں۔ میں نے کسی قسم کا پیشگی فیصلہ صادر کیے بغیر قرآن کی ایک ایک آیت کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ حقیقت میرے لیے بہ طور خاص چونکا دینے والی تھی کہ قرآن نے مظاہر کائنات کے بارے میں ایسے دقیق اشارے کیے ہیں جن کی تائید کائنات کے بارے میں جدید سائنسی تصورات سے ہوتی ہے۔ توریت میں ہم کو نمایاں طور پر سائنسی غلطیاں ملتی ہیں، مگر قرآن میں اس قسم کی کوئی غلطی نہیں ملتی۔ اس لیے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن کا مصنف اگر کوئی انسان ہوتا تو ساتویں صدی مسیحی میں وہ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتا تھا جو دورِ جدید کی سائنسی تحقیقات کی رو سے بالکل درست ہیں؟ ہمارے سامنے اس وقت بلاشبہ قرآن کا وہی ابتدائی نسخہ موجود ہے۔ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں کسی انسان کی معلومات ہزار سال بعد ہماری علمی سطح سے زیادہ وسیع اور جدید تر ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر قرآنی اشارے حیرت انگیز حد تک سائنسی پہلو رکھتے ہیں۔''

مستشرقین دوسرا اعتراض قرآن کے جمع و تدوین کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ وہ قرآن کو غیر محفوظ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مکمل قرآن عہد نبوی میں تحریری شکل میں موجود نہیں تھا۔ لوگ حافظہ پر اعتماد کرتے تھے۔ قرآن کی ترتیب و تدوین بہت بعد میں ہوئی ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو اور کچھ چیزوں کا اضافہ اس میں لوگوں نے اپنی طرف سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر مستشرق بلاشیر اپنی کتاب 'مقدمہ قرآن' میں کہتا ہے کہ پہلی بار نزولِ وحی کے وقت محمدؐ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ ممکن نہ تھا کہ وحی کے الفاظ آپ کو یاد رہے ہوں، آپ نے انہیں لکھ لیا ہو اور محفوظ رکھا ہو۔ وہ مزید کہتا ہے کہ کتابت و تحریر کے وسائل پر اس زمانے میں یہودیوں کا قبضہ تھا، جن کے ساتھ مسلمانوں کی کش مکش جاری تھی۔ اس بنا پر

عہد نبوی میں پورے قرآن کی کتابت ممکن نہ تھی۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ بعد میں جب قرآن کو ضبط تحریر میں لایا گیا تو اس میں کچھ دوسری چیزیں بھی شامل ہوگئی ہوں اور بعد کے لوگوں نے انہیں قرآن کا حصہ مان لیا ہو۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح محض تخیلات کی بنیاد پر اور امکانات کے سہارے عہد نبوی میں تدوین قرآن کا انکار کیا جا رہا ہے۔ جب کہ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ آیاتِ قرآنی کے نزول کے بعد انہیں لکھوالیا کرتے تھے۔ خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور متعدد دیگر صحابہ کتابتِ وحی کا کام انجام دیتے تھے۔ لکھنے کے لیے چمڑے کی کھالوں، کھجور کی ٹہنیوں، چوڑی ہڈیوں، پتّوں اور کاغذ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ لکھواتے وقت اللہ کے رسول ﷺ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ ترتیب میں کس آیت کو کہاں پر رکھا جائے؟ اس طرح آپ کی وفات کے وقت قرآن ہزاروں صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھا، اس کے علاوہ وہ تحریری شکل میں بھی موجود تھا۔ یہ تفصیلات کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں۔

مستشرقین کی ایک کوشش یہ بھی رہی ہے کہ آج کل قرآن کا جو متن پایا جاتا ہے اس میں وہ اختلافات اور اضطرابات کی نشان دہی کریں، تاکہ قرآن میں تحریف کا اثبات کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر مستشرق گولڈ زیہر (Gold Ziher) اپنی کتاب 'اسلامی تفسیر کے مکاتبِ فکر' میں بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ 'متن قرآن میں جتنے اضطرابات پائے جاتے ہیں اتنے کسی بھی مذہبی گروہ کے نزدیک تسلیم شدہ مذہبی صحیفہ میں نہیں پائے جاتے، وہ کہتا ہے کہ چوں کہ قرآن کا کوئی ایک متفقہ متن نہیں ہے، اس لیے اس کی تعبیر و تشریح میں اختلافات ہوئے ہیں۔ ان اختلافات کے نمونے ابتدائی کتب تفسیر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مستشرق آرتھر جیفری (Arther Jeffry) نے ابن ابوداؤد کی کتاب المصاحف کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں اس نے تفصیل سے اختلافِ قراءت کے موضوع پر بحث کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف مصاحف میں بعض آیات قرآنی کے الفاظ میں فرق پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں اختلافات قراءت کا مسئلہ اس نوعیت کا نہیں ہے جس طرح سے یہ مستشرقین پیش کرتے ہیں۔ بعض آیاتِ قرآنی میں ایک سے زائد قراءتیں منقول ہیں۔ اور ان کی روایت آں حضرت ﷺ سے ثابت ہے۔ آج پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس جو

قرآن موجود ہے، وہ ٹھیک ٹھیک اس طرح ہے جس طرح اللہ کے رسول کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی اصل زبانوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ جو کچھ ہے وہ ترجمے ہیں اور وہ بھی ایک سے زائد بار ضائع ہو چکے ہیں اور انہیں یادداشتوں کی بنیاد پر از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے مختلف نسخوں میں ہزاروں اختلافات ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف زمانوں میں ان میں لفظی تحریفات کی جاتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں خود مغربی اسکالروں کے اعترافات موجود ہیں۔

مستشرقین نے قرآن کریم کے بعض اسالیب، ترکیبوں، نظم کلام اور فصاحت و بلاغت کو بھی اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے مطابق کہیں کہیں قرآن کی زبان اور اسلوب اعلیٰ معیار سے فروتر ہے اور کہیں کہیں نحو و صرف (قواعد زبان) کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے یہ اعتراضات پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں چیلنج کیا کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر کسی کو اس معاملے میں شک ہو اور وہ اسے انسانی کاوش سمجھتا ہو تو اس جیسی چند آیتیں بنا کر پیش کرے۔ قرآن مسلسل یہ چیلنج پیش کرتا رہا، مگر کسی کو اسے قبول کرنے اور اس کا معارضہ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اس زمانے کے اہلِ عرب ادب کے شہ سوار اور فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مرتبے پر تھے۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ پر مختلف الزامات عائد کیے، مگر کسی کو اس کی زبان، اسلوب اور فصاحت و بلاغت پر حرف گیری کی جرأت نہ ہو سکی۔

قرآن کریم پر جو اعتراضات مستشرقین نے کیے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ اس کی عظمت و تقدس لوگوں کے دلوں سے ختم کر دیں اور اسے الہامی کتاب کے بجائے انسانی کاوش بنا کر پیش کریں، جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریف اور تبدیلی کا شکار ہوتی رہی ہے، لیکن وہ نہ اب تک اپنی کوشش میں کام یاب ہو سکے ہیں نہ آئندہ کام یاب ہوں گے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا خود ہی ذمہ لیا ہے۔

مستشرقین اور اسلام

ذکی الرحمٰن غازی فلاحی مدنی

پس منظر

صلیبی جنگوں کی تاریخ ہر غیرت مند مسلمان کے ذہن میں محفوظ ہے۔ صلیبی فوجیں دو محرکات کی بنا پر اقلیمِ اسلامیہ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ ان میں پہلا محرک انتہا پسندانہ دینی جذبہ اور اندھی مذہبی عصبیت کی آگ تھی جسے اربابِ کلیسا نے یورپین اقوام وافراد کے سینوں میں شعلہ فزاں کر دیا تھا۔ مسیحی پاپاؤں اور کہنوتی سربراہوں نے یورپین عوام کے ذہن ودماغ میں مسلمانوں کی بڑی گھناؤنی تصویر بیٹھا دی تھی اور جھوٹے الزامات ان پر چسپاں کر دیے تھے۔ مسیحی عوام کو یہ کہہ کر ورغلایا جاتا تھا کہ خداوندِ مسیح کی جائے پیدائش فلسطین کافروں -یعنی مسلمانوں- کے قبضے میں چلی گئی ہے جسے فی الفور آزاد کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں میں لڑنے کے لیے آنے والوں کی بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جو دینی عصبیت وغیرت کی وجہ سے گھر بار چھوڑ کر لڑنے آئے تھے۔ یہ لوگ اچھی نیت رکھتے تھے اور اعتقادی ومذہبی لحاظ سے مضبوط تھے، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے موت، قتل، مہاجرت اور بے سروسامانی کو گلے لگایا، مگر پیٹھ پھیرنا گوارا نہیں کیا۔

صلیبی حملہ آوروں کا دوسرا محرک سیاسی اور سامراجی نوعیت کا تھا۔ یورپ کے امراء ورؤساء نے سنا تھا کہ ممالکِ اسلامیہ میں سونے چاندی کی نہریں بہہ رہی ہیں، بالخصوص بلادِ شام اور اس کے ارد گرد کا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ سایہ امن وسکون، تہذیب وتمدن اور فارغ البالی وخوش حالی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہا ہے، جب کہ رومی عیسائی حکومت کے زیرِ سایہ یہی خطہ ماضی میں ان نعمتوں سے محروم تھا۔ یورپ کے اربابِ سیاست وحکومت نے یہ بھی سنا تھا کہ اسلامی ممالک میں زرخیز علاقوں، صنعتی ترقی کے موقعوں اور قدرتی ومعدنیاتی ذخائر وثروات کی ریل پیل ہے۔ چنانچہ منہ میں پانی لیے یہ ٹولہ خداوندِ مسیح کی مدد ونصرت کا

نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے اپنے غنیم کے ساتھ اسلامی دنیا پر حملہ آور ہوا، حالانکہ سچ بات یہ ہے کہ اس کے دل میں دینِ مسیح کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف اپنی مملکت کے پھیلاؤ، اور اسلامی ممالک کی دولت وثروت کی لوٹ کھسوٹ کے ارادے سے آئے تھے۔ یہ صلیبی جنگوں کا دوسرا بڑا محرک تھا۔

دوصدیوں تک ہلال اور صلیب کے بیچ خوں ریز جنگوں کا سلسلہ قائم رہا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت وتائید سے بالآخر مسلمانوں نے صلیبی حملوں کو ناکام کر دیا اور یورپی طاقتوں کو استعماری عزائم کے ساتھ خالی ہاتھ واپس لوٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسلامی ملکوں میں صلیبی حکمرانوں نے دہائیوں پر محیط ان جنگوں کے دوران جو چھوٹی موٹی ریاستیں قائم کی تھیں ان کا بھی جلد ہی صفایا ہوگیا۔ حسرت اور ناکامی کے احساس کے ساتھ اور پیشانی پر ہزیمت وپسپائی کا داغ لیے یورپین اقوام واپسی پر مجبور ہوئیں۔ تاہم دو صدیوں تک مسلمانوں کے ساتھ نبردآزما ہونے اور مسلم ممالک واوطان میں آمدورفت رکھنے کا ضمنی فائدہ انہیں یہ ملا کہ لاشعوری طور پر یورپ کا سوچنے سمجھنے والا طبقہ اسلام کی حقانیت اور اس کی تہذیبی وتمدنی شناخت سے متاثر ہوگیا اور اسلامی آداب اور اجتماعیت کے اثرات وثمرات یورپی ملکوں میں پہنچے جو کہ اب تک اِن سے محروم تھے۔

یورپی قوموں نے تو اس بات پر صبر کر لیا کہ ان کے نصیب میں اسلامی ممالک پر غلبے کی تمنا کا برآنا نہیں ہے، تاہم یورپ کے رؤساء وامراء کبھی اپنے اس ارادے سے دست بردار نہ ہو پائے کہ انہیں مسلم ممالک کو زیرِ نگیں لانا ہے، پھر چاہے اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے اور اس کی جو چاہے قیمت انھیں چکانی پڑے۔ عسکری وسیاسی محاذ پر شکست کھانے کے بعد انہوں نے امتِ مسلمہ کے احوال وکوائف کا باریکی سے جائزہ لینا شروع کیا تاکہ اس بار مسلمانوں پر ثقافتی اور فکری یلغار کی جائے۔ یہی وہ تخم ہے جس کے برگ وبار کی شکل میں رفتہ رفتہ مستشرقین کی انجمنیں اور جمعیتیں قائم ہونا شروع ہوئیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ شروعات میں ان استشراقی پلیٹ فارموں پر یہودی اور مسیحی مذہبی طبقے کا غلبہ رہا تھا۔ اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور ان کے تئیں سخت تعصب برتتے تھے۔

تعصب کے اثرات

یقیناً ہمیں اس سے انکار نہیں کہ مشنری ذہنیت رکھنے والے متعصب اسکالروں میں کچھ انصاف پسند مستشرقین بھی شامل تھے، جنہوں نے اسلامی علوم وفنون پر بھرپور توجہ دی اور مسلمانوں کے تاریخی اور

علمی کارناموں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ تاہم ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ روزِ اول سے آج تک مسلسل مغربی اسکالروں اور مستشرقوں میں جن لوگوں نے بھی مشرقی اقوام وادیان کو اپنے مطالعے اور بحث وتحقیق کا موضوع بنایا ہے ان کی اکثریت متعصب دینی رہ نماؤں اور پیشواؤں پر مشتمل رہی ہے جو اپنی دینی تنگ نظری کے سبب ہر ممکن طریقے سے اسلام کی غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کی مقدس اور محفوظ تعلیمات کو محرّف اور غلط ثابت کرنے کے خواہاں اور کوشاں ہیں اور مسلمانوں کی تہذیبی وتمدنی بالادستی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ ایسے متعصب مستشرقین کی تحقیقات ومطالعات کی چند نمایاں علامتیں ہیں۔

۱- یہ کہ وہ اسلام اور اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کے اہداف ومقاصد کے تئیں اپنی بدگمانی وبےاطمینانی ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۲- دوسری علامت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی جلیل القدر شخصیتوں (جیسے کہ علماء، محدثین، فقہاء، سیاست داں اور نامور خلفاء وسلاطین) سے یہ حضرات نالاں ہیں اور سب کے خلاف جم کر زہر اگلتے ہیں۔

۳- تیسری بات یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں قرونِ اولیٰ کے مسلم معاشروں کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ بڑی گھناؤنی اور بدصورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پورا مسلم سماج اس زمانے میں انانیت اور خودغرضی اور ذاتی مفادات کے لیے دین کے استحصال کا اسٹیج بن گیا تھا۔

۴- چوتھی بات یہ ہے ان کی کتابوں سے اسلامی تہذیب وتمدن کا جو نقشہ یا خاکہ تیار ہوتا ہے وہ حقیقتِ واقعہ سے کافی فروتر اور ایک حد تک توہین آمیز ہوتا ہے، اور اسے دیکھنے والے کے اندر اسلام کی تہذیبی نوازشوں اور عنایتوں کے تئیں استخفاف کا رویہ پیدا ہوتا ہے۔

۵- ان مستشرقین کی کتابوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسلامی معاشرے کی اصل طبیعت اور فطرت سے تجاہلِ عارفانہ برتا جاتا ہے اور ہر خوبی یا خامی کو خاص ملکی یا قومی یا لسانی فوارق وامتیازات کا مرہونِ امت اور حاصل باور کرایا جاتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ امتِ واحدہ کے تصور سے اور دینِ اسلام کی تہذیبی کامیابیوں کی طرف سے ذہن ہٹ جاتا ہے۔

۶- ان مستشرقین کا خاصہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ پہلے سے ذہنوں میں ایک تصور قائم کر لیتے ہیں، پھر

تاریخی اور دینی نصوص وواقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے خاص نظریے اور مصنوعی تصور کے مطابق انہیں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اپنے پسندیدہ نظریے کے خلاف پڑنے والی دینی نصوص اور تاریخی معلومات کو مشکوک بتا کر یا بنا کر ڈھٹائی سے رد کر دیتے ہیں۔خود ساختہ نظریات کی تائید وتوثیق میں یہ اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ حوالے کتابوں کے لی گئی عبارتوں میں قطع وبرید کر ڈالتے ہیں یا جان بوجھ کر الفاظ سے ایسے معانی ومفاہیم کشید کرتے ہیں جو ان سے نہیں نکلتے۔یہ عمل معنوی تحریف کے دائرے میں آتا ہے۔

۷-ان کی تحریروں کا خاصہ یہ بھی ہے کہ اپنے مطلب کی بات ہو تو اس کی تائید میں دلیل کمزور ترین مصدرِ معلومات سے بھی قبول کر لیتے ہیں، اور ان کے نظریات کے خلاف جائے تو بیّن حقائق بھی قبول نہیں کرتے، پھر چاہے ان روشن دلائل کا مصدر ومأ خذ انتہائی حد تک قابلِ اعتماد اور مستند کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر حدیث اور محدثین کی تاریخ مرتب کرتے وقت یہ کتبِ ادب ولسانیات سے معلومات اکٹھا کرتے ہیں۔فقہ کی تاریخ پر بات کرتے ہوئے حوالے کے طور پر یہ بادشاہوں کی تاریخ سے استدلال کرتے ہیں، دمیریؒ نے حیاۃ الحیوان کے نام سے اُس زمانے میں جانوروں سے متعلق معلومات کا جو مجموعہ تیار کیا تھا، یہ لوگ کھلے دل سے اس میں درج بے سند روایات قبول کر لیں گے، مگر امام مالکؒ بن انس نے مؤطا میں کوئی حدیث درج کی ہے جو اِن کے نظریات کے خلاف جاتی ہے تو اسے بے محابا رد کر دیں گے، یا سرے سے قلم انداز کر ڈالیں گے۔خواہشِ نفس کی پیروی اور حق سے پہلوتہی میں اندھے ہو کر یہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔

دائرۂ اثر کی توسیع

ان مذکورہ بالا منہاجی خامیوں کے ساتھ مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے۔تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر، ادبِ عربی، اسلامی تہذیب وغیرہ پر ان حضرات کی نگارشات منظرِ عام پر آئی ہیں۔پھر مغرب کی عیسائی حکومتوں نے بھی مستشرقین کی ہمت افزائی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔علاوہ ازیں یورپ کے کتب خانوں میں قدیم کتابوں کی شکل میں مصادرِ معلومات کی کمی نہ تھی۔یہ لوگ خالص مطالعے وتحقیق کے لیے فارغ تھے۔ان میں سے ہر ایک نے کسی ایک فن یا ایک فن کے کسی مخصوص ناحیے کو ہی عمر بھر کی بحث وتحقیق کا موضوع بنایا اور پوری توانائیاں اور ساعتیں اس میں لگا

دیں۔ان تمام عوامل کی وجہ سے مستشرقین کی کتابیں اور مقالات علمی گہرائی و گیرائی سے متصف ہوکر دنیا کے سامنے آئے۔انہوں نے اپنی تالیفات میں اس قدر حوالوں کا اہتمام کیا جو بہر حال موجودہ دور کے مسلم علماء وفضلاء عام طور پر نہیں کر پاتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کے حالات مستشرقین کے حالات سے یکسر مختلف ہیں۔

مسلم اسکالرس کو ایسے ملکوں میں جینا پڑا ہے جن کی داخلہ اور خارجہ پالیسیاں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ جہاں فقر وافلاس کی مار ہے اور سماجی و معاشی توازن مفقود ہے۔حکومتوں اور سرکاری اداروں کی طرف سے ان کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی، بلکہ بحث وتحقیق کو یک گونہ کارِ لایعنی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے دین علمی کاموں کے لیے اس طرح کی فرصت اور فراغت میسر نہیں پاتے جو اربابِ استشراق کو پہلے بھی میسر تھی اور آج بھی میسر ہے۔

بہر حال رفتہ رفتہ یہ ہوگیا کہ اسلامی موضوعات پر بجائے اس کے کہ مسلم علماء وفضلاء کی کتابیں اور تحریریں مرجعِ خلائق بنتیں اور ان کی روشنی میں اسلام، اسلامی تاریخ اور مسلم امت کا مطالعہ کیا جاتا،مغربی تعلیم یافتہ مسلم وغیر مسلم طبقوں میں مستشرقین کی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ان کی بڑی پذیرائی کی گئی۔بالخصوص وہ طبقہ جو انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کا دلدادہ تھا،استشراقی مطالعات وتحقیقات کو ہر موضوع پر حرفِ آخر سمجھنے لگا۔یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں تحقیقی مقالات تیار کرنے والے طلبہ واساتذہ استشراقی مقالات وکتب سے دھوکہ کھا گئے اور سمجھنے لگے کہ مستشرقین کی علمی دیانت داری اور حق پسندی ہر شک وشبہے سے بالاتر ہے۔چنانچہ اس راستے سے پڑھ لکھ کر آنے والوں نے بے تکان اپنی تحریروں میں مستشرقین کی آراء وافکار کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ان میں کچھ تو وہ تھے جن کے لیے یہ سرمایۂ عزت وافتخار کافی تھا کہ وہ مستشرقین کی کتابیں پڑھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور ان کی روشنی میں لکھتے ہیں۔ جب کہ کچھ شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے اس حد تک گرے کہ مستشرقین کے آراء وافکار کو دینی رنگ وآہنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔(۱)

عمومی اندازِ گفتگو

مستشرقوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کتبِ حدیث وتفسیر اور تاریخ کا خاص نقطۂ نظر سے جائزہ لیا اور ان کتابوں میں پائی جانے والی کمزور اور جعلی روایات یہاں وہاں سے جٹانا شروع

کیں۔ضعیف اور موضوع روایات مستشرقین کی توجہات کا خصوصی مرکز بنیں جن سے دینِ اسلام کی شبیہ خراب کرنے میں کسی بھی اعتبار سے مدد مل سکتی تھی۔اپنی کتابوں میں قدم قدم پر انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ خالص علمی و تحقیقی انداز میں اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات کا جائزہ لے رہے ہیں،مگر در پردہ مقصد ان کا یہ تھا کہ دینِ حق اسلام کو دنیا کی نظر میں مطعون و مخدوش دکھائیں اور اس کے مقابلے میں عیسائیت کو ہر لحاظ سے اعلیٰ وارفع دین باور کرائیں۔استشراقی مطالعات میں خاص طور سے قرآنِ کریم کے تعلق سے عجیب وغریب روایات سے استدلال کیا جاتا ہے اور انتہائی غیر سنجیدہ اور خلافِ واقعہ اور مخالفِ عقل نتائج ان سے نکالے جاتے ہیں اور اپنی طرف سے غلط سلط توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔مستشرقین نے موضوع روایات کی روشنی میں اسلام،نبیِ اسلام ﷺ اور احکام وتاریخِ اسلام کی ایک خودساختہ اور بدنما تصویر بنالی ہے جو بہر حال حقیقی تصویر سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔

اسلام پر ان کی گفتگو کا عمومی انداز کچھ اس طرح ہوتا ہے:

اسلام سرے سے مذہب ہی نہیں ہے۔یہ تو بس جنگی ٹولے کا ضابطۂ اخلاق ہے۔(۲) یہ عربِ جاہلیہ کی ''مروۃ'' کا بدلا ہوا نام ہے۔(۳) یہ دنیاوی مذہب ہے،مذہبِ نجات نہیں ہے۔(۴) یہ لوٹ مار کا انفرادیت پسند مذہب ہے،اجتماعیت سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں۔(۵) یہ یہودیت اور عیسائیت کا ملغوبہ ہے۔(۶) یہ دینِ ابراہیمی کی تجدید نہیں،بالکل نوایجاد مذہب ہے۔(۷) اسلام کے ارکان وعبادات دوسرے مذاہب سے لیے گئے ہیں۔توحید اور عقائد یہودیت اور عیسائیت سے مستعار ہیں۔حج،طواف،تقبیلِ حجر اور قربانی کی رسمیں مقامی عرب مذاہب سے مفاہمت کی نشانی ہے۔(۸) اسلام میں شدید جمود ہے،یہ ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔اس کی قدریں اپنی افادیت کھو رہی ہیں۔سود کی حرمت،پردہ اور شرعی سزاؤں سے خود مسلم سماج بےزار ہے جس کی دلیل وہ فکری کتابیں ہیں جنہیں نام نہاد مسلم مصنّفین چھاپ رہے ہیں۔مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کا ذمے دار ان کا دین ہے۔

مستشرقین نے حیاتِ طیبہ پر بھی بے شمار اعتراضات کیے ہیں،بلکہ سب سے زیادہ استشراقی ہرزہ سرائیوں کا نشانہ سیرتِ پاک ہی بنی ہے۔نبیِ صادق ومصدوق کو-معاذ اللہ-فریبی ومکار کہا گیا۔آپ ﷺ کی عالی نسبی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔بہتوں نے نبیِ کریم ﷺ کے خیالی معلم دریافت

کیے۔ حیاتِ طیبہ کے حوالے سے مبتذل اور بازاری قصے تصنیف کر دیے۔ کسی کو حیاتِ طیبہ عیش وعشرت کی زندگی نظر آئی۔

اس قسم کی تحریروں اور مزعومہ تحقیقات سے مستشرقین کا مقصد اور مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ اس طرح سے وہ مسلمانوں میں ایک طرح کا روحانی ووجدانی کھوکھلا پن اور احساسِ کہتری وکمتری پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ محکوم مسلمان دنیا کے مغربی بالا دستوں کو ہمیشہ اپنے سے برتر خیال کریں اور ان کی چشمِ ابرو کے ہر اشارے پر سرِ تسلیم خم کرتے جائیں۔ نتیجتاً تہذیبی واعتقادی خود اعتمادی ان میں دم توڑ دے کیونکہ یہی چیز ہے جو انسان کو دوسروں کی نقالی سے باز رکھتی ہے۔

مستشرقین کی سرگرمیوں کے متعدد میدان ہیں۔ سب سے زیادہ وہ علمی میگزینوں اور تحقیقی کتابوں اور ماہناموں کی اشاعت پر زور دیتے ہیں۔ غالباً ان کی سب سے خطرناک اور دوررس نتائج کی حامل کوشش وہ ہے جسے اسلامی علوم کا انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف الإسلامیۃ) کہا جاتا ہے اور جو مستشرقین نے کئی زبانوں میں شائع کیا ہے۔ اس کام میں خطرے کا پہلو یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی علوم سے بہ ظاہر تعلق رکھنے والے اس ''دائرۃ المعارف'' میں مستشرقین نے بہت ساری خلافِ واقعہ اور مخالفِ اسلام باتیں ڈال دی ہیں اور بہت سے مسلمان مفکرین اور اسکالرس ان فراہم شدہ معلومات پر تکیہ کرتے ہیں اور اسلام کے تعلق سے اس میں جو غلط بیانی، تحریف ودجل اور خلطِ مبحث ہوا ہے اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آغاز سے مستشرقین کی کاوشوں کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان ہیں۔ وہ تمام فکری ومذہبی رجحانات کا نوٹس لیتے ہیں اور ہر اس تحریک اور جماعت کے تئیں حفظِ ماتقدم اور ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں جو کسی طور سے بھی آگے چل کر ان کی راہ کھوٹی کر سکتی ہے، یا ان کے زیرِ غور منصوبوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ مستشرقین میں سے اگر کوئی شخص فطرتِ سلیمہ اور ضمیر کی آواز پر غیر جانب داری برتنے کی کوشش کرتا ہے اور اسلام کے خلاف تعصّبات کی سیاہ پٹّی اتار پھینکتا ہے تو دیگر اربابِ استشراق ہاتھ منھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اسے حلقۂ دانشوراں سے تڑی پار کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی تعریف کرنے والے ہر صاحبِ علم سے انھیں چڑ ہے اور اس سے ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ غیر جانب داری سے کام لے اور اپنی تحریروں میں نقد وتمحیص کا بلند معیار برقرار رکھے، جس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی طور سے اسلام اور مسلمانوں کی کسی خوبی، برتری یا ان کے کسی تہذیبی وتعمیری رول کا اعتراف نہ

ہونے پائے۔

مسلم مفکرین اور مستشرقین

عقل ششدر ہے کہ کس حد تک اہلِ استشراق اسلامی تاریخ کی تحریف میں، دینِ اسلام کی تعلیمات اور تہذیب وثقافت کی سبوتاژی میں اور مسلمانوں کے تعلق سے غلط افسانوں اور کہانیوں کی نشرواشاعت میں جی جان سے لگے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات جملہ وسائل وذرائع استعمال کرتے ہوئے ہمہ تن مصروف ہیں کہ اسلام نے انسانی تہذیب وتمدن کی تعمیر وارتقاء میں جو بے مثال قائدانہ رول ادا کیا ہے اسے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کردیں۔ اسلام دشمنی کی حد تک تقریباً تمام مستشرقین متفق الخیال ہیں، تاہم اختلاف اس میں ہے کہ دشمنی کس درجے میں ہو۔ ابتداء میں اگرچہ تحریکِ استشراق کا قیام عیسائی پادریوں اور مشنریوں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا، تاہم بعد میں اس تحریک کو مغرب کی سامراجی طاقتوں نے ٹیک اوور کرلیا ہے۔ آج ہمارے سیکولر تعلیم یافتہ علمی حلقوں میں ان مستشرقین کی کتابوں کو حرفِ آخر کے طور پر دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ آج بھی نامور مستشرقین کی بڑی تعداد متعصب مذہبی جماعتوں کی ممبرشپ رکھتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ مختلف القاب واسماء کے خول میں وہ اپنی حقیقی شناخت چھپاتے ہیں۔(۹)

اس سلسلے میں ہمارے بعض اہلِ قلم کا یہ رویہ افسوس ناک ہے کہ وہ اسلامی مسلّمات کی تائید میں بات میں زور پیدا کرنے کے لیے مستشرقین کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کے دو نقصانات ہیں۔ ایک تو لاشعوری طور پر قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اسلام بے چارہ اپنی صداقت کے اثبات کے لیے غیروں کی تائید وتوثیق کا محتاج ہے۔ دوم آگے چل کر قاری اگر ایسے کسی مستشرق کی تحریر میں اسلام کی مخالفت دیکھتا ہے تو چونکہ پہلے سے اس کا ذہن بن گیا ہوتا ہے کہ فلاں مستشرق بڑا منصف شعار اور اسلام پسند ہے، اس لیے ہو وہ سمجھتا ہے کہ نہ ہو اس کا یہ اعتراض وزنی اور مبنی برحقیقت ہے۔ بہ طورِ مثال میں یہاں دو حوالے دوں گا۔ ''جارج برنارڈ شا'' کی علمی عظمت کا اعتراف کسے نہیں ہے۔ یہ آزادیِ فکر کے عظیم علم برداروں میں سے ایک ہیں۔ ان کا یہ مشہور قول غالباً علم سے دلچسپی رکھنے والے قارئین نے درجنوں بار پڑھا ہوگا کہ اگر محمد کو آج دنیا کی ڈکٹیٹرشپ دے دی جائے تو وہ اس کے لاتعداد مسائل چند سالوں میں حل کردیں گے۔ مگر یہی برنارڈ شا ایک دوسرے موقعے پر جب داعیِ اسلام حضرت محمد ﷺ

کا ذکر کرتے ہیں تو عجیب سوقیانہ اور تبذلانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ باور نہیں ہوتا کہ یہ انہوں نے ہی لکھا ہوگا: ''محمد (ﷺ) عرب کے تند خو قبائل کو پتھروں کی پرستش سے ہٹا کر ایک خالص توحید کو منوانے کا عزم اور ہمت تو کر سکتے تھے، مگر کسی حسین خاتون کی دعوت پر 'نا' کہہ دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔''[It coiuld nerve Mahomet to convert the fierce tribes of Arabia frwom worshiping stones to an exalted monotheism, but it could not make him say no to a pretty woman.](۱۰)

دوسری مثال تھامس کارلائل کی ہے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو گروہِ انبیاء کا ہیرو تسلیم کیا ہے اور اسی حوالے سے مسلم قلم کاروں کی تحریروں اور تقریروں میں کارلائل کے حوالے خوب ملتے ہیں۔ مگر یہی کارلائل جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو ساری خوش فہمی رفع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ہی یہ لکھا ہے: ''میری زندگی کی سب سے زیادہ محنت طلب خواندگی، ایک اُکتا دینے والا، پریشان، بے ترتیب مجموعہ، خام، ناپختہ، لامتناہی تکرار، طول طویل گفتگو، الجھاؤ، انتہائی پست معیار اور غیر نفیس، ناقابلِ دفاع حماقت۔ مختصر یہ کہ سوائے ادائے فرض کے احساس کے، کسی یورپی شخص کو کوئی چیز قرآن کو پورا پڑھ ڈالنے پر آمادہ نہیں کر سکتی ہے۔''[As toilsome reading as i ever undertook, a wearisome confused jumble, crude, incondite, endless iterations, long windedness, entanglements, most crude incondite, insupportable stupidity; in short nothing but a sense of duty could carry any European through Koran.](۱۱)

قرآن اور مستشرقین

مستشرقین نے قرآن پر بھی اعتراضات کیے ہیں، اور قرآن کی اس حیثیتِ عرفی کو مجروح کرنے کی نامحمود سعی کی ہے کہ وہ مسلمانوں کی کتابِ مقدس اور دستورِ زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے آخری نبی ﷺ پر نازل کیا تھا تاکہ وہ اس کی عملی تفہیم کرائیں اور دنیا و آخرت میں جس قدر رہنمائیوں کی ضرورت نوعِ انسانی کو ہو سکتی ہے فراہم کر دیں۔ امتِ مسلمہ کے تناظر میں چونکہ قرآنِ کریم کو بڑی اہمیت و عظمت حاصل ہے، اس لیے مستشرقین نے اور ان سے پہلے ملحدین نے سب سے زیادہ نقد

واعتراض کا موضوع اسی کو بنایا ہے اور اس کی صداقت وحقانیت پر شبہات قائم کرنے کا ہر ممکن جتن کیا ہے۔ تا کہ اس سے فرزندانِ ملت کا اس کتابِ محکم پر ایمان متزلزل ہو جائے اور وہ دشمنانِ دین کی ریشہ دوانیوں کے لیے لقمۂ تر ثابت ہوں۔

اس تعلق سے علامہ زاہد کوثریؒ فرماتے ہیں:

''ادھر چند دہائیوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی مستشرقین نے خاص توجہ کے ساتھ متقدمین علمائے اسلام کی کتابوں کی نشر واشاعت کا اہتمام کیا ہے، بالخصوص وہ کتابیں جن کا تعلق قرآنِ کریم اور علومِ قرآنیہ سے واقعتاً ہے یا کسی طرح سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً کتب القرائات، کتب الرسم والکتابت، شاذ قرأتوں کی کتابیں، کتبِ طبقات وغیرہ۔ بلکہ یہ مستشرقین اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں اور حدیث، فقہ اور لغت وغیرہ مشرقی واسلامی علوم وفنون پر لکھی گئیں قدیم کتابوں کو نئے رنگ وآہنگ میں شائع کر رہے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر افراد کی کوشش یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کی اسپرٹ کو پھر سے مغربی عوام کے اندر بیدار کر دیا جائے۔ اس لیے یہ لوگ اپنی کتابوں میں تعصب اور جہلِ مرکّب میں لتھڑے ہوئے رکیک حملے کر رہے ہیں اور قرآنِ کریم کی روشنی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کیونکہ اسی قرآن نے کسی زمانے میں تاریک دنیا کو منور کر دیا تھا۔ اس کی ضیاپاشیوں سے کفر وباطل کی نگاہیں خیرہ ہو گئی تھیں، بھٹکتی انسانیت فوج درفوج دینِ حق میں داخل ہوئی تھی اور کرۂ معمورہ کی کایا پلٹ گئی تھی۔ مستشرقین کے اس طبقے کی غرض وغایت آفتابِ نصف النہار کی طرح واضح ہے، اب چاہے یہ مکاری اور دھوکہ دھڑی کرتے ہوئے جس قدر علمیت ودیانت اور بحث وتحقیق کا دعویٰ کریں اور جتنا چاہے اپنے آپ کو غیر جانب دار اور منصف شدار دِکھلائیں۔'' (۱۲)

دشمنانِ دین نے ہر زمانے میں قرآنِ کریم کی حقانیت وصداقت کو مشتبہ بنانے کی ناکام کوشش کی ہے تا کہ مسلمانوں کو شک میں مبتلا کر سکیں اور غیر مسلم متلاشیانِ حق کو اسلام کی طرف آنے سے باز رکھا جاسکے۔ قدیم دشمنانِ دین میں یہ کام کرنے والے یہودی اور مجوسی گروہ تھے۔ نیز زندیقوں کا وہ گروہ بھی تھا جو بہ ظاہر اسلام میں داخل ہوا تھا مگر اندر سے کفر ونفاق پر قائم تھا اور خفیہ طور سے چالیں چلنے میں یقین رکھتا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے قرآن کی الٹی سیدھی تاویلات کا سہارا لیا اور الفاظ وآیاتِ قرآنی کو ان کے ظاہری مفہوم سے پھیر کر انہیں باطنی معنی پہنائے جنہیں اگر تسلیم کر لیا جائے تو دینی عقائد اور اوامر

شرعیہ سب کا بیک وقت خاتمہ ہو جائے۔

جدید دور میں اس رخ پر کام کرتے ہوئے مستشرقین نے بھی قرآنِ کریم کی حقانیت وصداقت پر سوالات قائم کیے ہیں۔قرآن کے بارے میں مستشرقین کی گفتگو کا عمومی لب ولہجہ اوپر کارلائل کے ایک اقتباس میں گزر چکا ہے۔مزید یہ ملاحظہ فرمائیں:''قرآنی مضامین بائبل اور دیگر کتبِ مقدسہ سے لیے گئے ہیں۔(انٹرڈکشن ٹو ڈبلیو، ایچ پالمرس ٹرانسلیشن آف دا کوران، آر اے نکلسن) قرآن کا پہلا ایڈیشن غائب ہوگیا ہے۔ موجودہ نسخہ نظرِ ثانی اور حذف واضافوں کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔(۱۳) قرآن نے مریم اور ہامان کے بیان کے سلسلے میں ٹھوکر کھائی ہے۔قرآن عرب شعراء کے دیوان کی مانند بے ربط اور معنوی وموضوعی ترتیب سے خالی ہے۔(۱۴) قرآنی فضائل کی حدیثیں سب کی سب گھڑی ہوئی ہیں۔ان سب کو دوسری صدی ہجری میں قرآنی مضامین کی تشریح کی غرض سے وضع کیا گیا تھا۔(۱۵) قرآنی احکام وقوانین کا نفاذ کسی بھی دور میں مشکل تھا،مگر آج تو ناممکن ہے۔(۱۶) آر اے نکلسن کے نزدیک ایک ادبی کارنامے کی حیثیت سے قرآن میں کئی خامیاں پائی جاتی ہیں،اور قرآن جنت میں مادی عیش وعشرت کا جو کچھ تذکرہ کرتا ہے وہ اصل میں بت پرستانہ تخیلات اور تمناؤں کا اظہار ہے۔

اس سلسلے میں تعصب کا سب سے بڑا نمائندہ ایک جرمن نژاد یہودی مستشرق گولڈزیہر ہے جو اسلام دشمنی میں دیگر سب پر بازی لے گیا ہے اور دینِ حق سے عداوت ونفرت جس کی زندگی کا وظیفہ بنی رہی ہے۔علامہ زاہد کوثری نے مستشرقین کی کتابوں پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں گولڈزیہر کا تعارف کرایا ہے، وہاں لکھا ہے:''یہ ایک فن کار حیلہ جو اور الفاظ سے دل پسند مفہوم نکالنے میں ماہر ومشّاق شخص ہے، اپنے مقصد کی تکمیل میں معاون بننے والی عبارتوں کو جہاں تہاں سے نکال لاتا ہے اور ان سے وہ مفہوم کشید کرتا ہے جس کی وہ حقیقتاً متحمل نہیں ہوتیں، اور اس سلسلے میں ہرگز یہ لحاظ نہیں کرتا کہ کس کتاب یا معلوماتی مصدر کی کیا تاریخی حیثیت ہے اور اس پر اہلِ علم نے کس قدر بھروسا اور اعتماد کیا ہے۔'' (۱۷) گولڈزیہر کی کئی اہم کتابیں ہیں جن کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔اس کی دو کتابیں ''العقیدۃ والشریعۃ فی الإسلام'' اور ''مذاہب التفسیر الإسلامی'' سب سے زیادہ بدنام اور مختلف فیہ کتابیں ہیں۔آخر الذکر کتاب میں اس نے خاص طور سے قرآن کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

مراجع ومصادر

۱۔ دیکھیں: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، مصطفیٰ سباعیؒ: ص۳۶۴-۳۶۶
۲۔ ویبر اینڈ اسلام، براین ایس ٹرنر: ص۱
۳۔ گولڈزیہر، مسلم اسٹڈیز: ص۲۲
۴۔ مسلمس آف برٹش انڈیا، پ ہارڈی: ص۱۷۵
۵۔ محمد، میکزم روڈنسن: ص۷۷
۶۔ دار یلیجن آف اسلام، کلین ایف اے: ص۲۱
۷۔ این اپالوجی فار محمد، ڈیوین پورٹ جے: ص۱۳۸
۸۔ کرشچین میسیج ان دانان کرشچین ورلڈ، ایچ کرامر: ص۲۹۰
۹۔ دیکھیں المبشر ون والمستشر قون فی موقفھم من الاسلام، محمد البہی: ص۱۲-۱۶
۱۰۔ شا آن ریلیجن، ایڈیٹڈ بائی وارین سلواسٹر: ص۱۴۱
۱۱۔ آن ہیروز، ہیروورشپ این دا ہیرونک ین ہسٹری: ص۶۴-۶۵
۱۲۔ مقالات الکوثری: ص۱۷
۱۳۔ لائف آف محمد، میور: ص۵۵۵-۵۵۷
۱۴۔ ڈکشنری آف اسلام، نولڈ یکے: ص۴۸۶-۴۸۷
۱۵۔ داریلیجن آف اسلام، کلین: ص۴۴
۱۶۔ میڈیول اسلام، وان گرون بوم: ص۱۴۳-۱۴۴
۱۷۔ من عبر التاریخ، زاہد کوثری: ص۲۶

استشراق اور مستشرقین: آغاز و ہدف

(ایک تحقیقی مطالعہ)

ڈاکٹر محمد اسامہ شعیب

"Orientalism" لاطینی لفظ "Oriens"(Rising) اور یونانی لفظ "He'oros"(The Direction Of The Rising Sun) سے نکلا ہے۔ یہ (Occident) کی ضد ہے۔ اب یورپ میں "Orientalism" کی جگہ لفظ 'ایشین اسٹڈیز' (Asian Studies) کا استعمال کیا جاتا ہے، نیز مستشرقین نے اپنے لیے مستعربون (Arabists)، اسلامسٹ (Islami) اور ماہرینِ مطالعہ ممالک (Area Studies Experts) وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

انگریزی زبان میں 'شرق' کے لیے "Orient"، 'استشراق' کے لیے "Orientalism" اور مستشرقین کے لیے "Orientalists" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کا ترجمہ 'استشراق' سے کیا گیا ہے۔ اس کا سہ حرفی مادہ 'شرق' ہے، جس کا مطلب 'روشنی' اور 'چمک' ہے۔(1)

لفظ 'شرق' کو جب باب استفعال کے وزن پر لایا جائے تو 'ا، س، ت' کے اضافے سے 'استشراق' بن جاتا ہے اور اس میں طلب کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا 'استشراق' سے مراد مشرق کی طلب ہے۔ عربی لغات کی رو سے مشرق کی یہ طلب علوم شرق، آداب، لغات اور ادیان تک محدود ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

''استشراق اور مستشرق کی اصطلاحات orient سے مشتق ہیں۔''(2)

مغرب کے رہنے والے علماء اور مفکرین جب مشرقی علوم وفنون کو اپنی تحقیق و تفتیش کا مرکز ومحور بناتے ہیں تو اسے استشراق کہا جاتا ہے۔ جدید لغات میں بھی اس کا یہی مفہوم اختیار کیا گیا ہے۔ ورڈ ویب انگلش ڈکشنری کے مطابق:

"The scholarly knowledge of Asian cultures and languages and people".(3)

''ایشیائی ثقافت اور زبانوں کے عالمانہ مطالعے کا نام استشر اق ہے''۔

ایڈورڈ سعید(Edward Said) تحریک استشر اق اور مستشرق کے الفاظ کو وسعت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Any one who teaches, writes about, or researches the orient-and this applies whether the person is an anthropologist, socialogist, historian, or philologist-either in its specific or its general aspects, is an orientalist, and what he or she does is Orientalism."(4)

''جو کوئی بھی مشرق کے بارے میں پڑھتا، لکھتا یا اس پر تحقیق کرتا ہے تو یہ تحقیقی معیار تمام تر پڑھنے لکھنے اور تحقیق کرنے والے ماہر بشریات، ماہر عمرانیات، مورخین اور ماہر لسانیات پر منطبق ہوتا ہے۔ خواہ یہ لوگ اپنے اپنے دائرۂ شخصی میں خاص موضوع یا کسی عمومی مضمون پر کام کر رہے ہوں، مشرق شناس (مستشرق) کہلاتے ہیں اور ان کا کیا جانے والا کام شرق شناسی ہوگا''۔

البتہ ڈاکٹر اسمٰعیل علی محمد نے ''مستشرق' سے مراد صرف مغربی تحقیق نگار کو لیا ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا عیسائی، یہودی اور ملحد ہو۔(5)

عربی زبان کی لغت ''المنجد'' کے مطابق:

''المستشرق :العالم باللغات والأداب والعلوم الشرقية والاسم الاستشراق''.(6)

''مشرقی زبانوں، آداب اور علوم کے عالم کو مستشرق کہا جاتا ہے اور اس علم کا نام استشر اق ہے۔''

ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے لکھا ہے:

''استشر اق، کفار اور اہل کتاب کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مختلف موضوعات مثلاً عقائد وشریعت، ثقافت، تہذیب، تاریخ اور نظامِ حکومت سے متعلق کی گئی

تحقیق اور مطالعہ کا نام ہے جس کا مقصد اسلامی مشرق پر اپنی نسلی و ثقافتی برتری کے زعم میں مسلمانوں پر اہلِ مغرب کا تسلّط قائم رکھنے کے لیے ان کو اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کرنا اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنا ہے''۔(7)

ڈاکٹر عمر بن ابراہیم رضوان نے استشراق کی تعریف کچھ یوں بیان کی ہے:

فالاستشراق اذن هی دراسة الغربيين عن الشرق من ناحية عقائده و أو تاريخه أو آدابه......الی غير ذلک.(8)

''استشراق سے مراد اہل مغرب کا مشرق کے عقائد، تاریخ اور فنون وادب کا مطالعہ کرنا ہے۔''

فاروق عمر فوزی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

فهو علم يدرس لغات شعوب الشرق و تراثهم وحضاراتهم ومجتمعاتهم و ماضيهم و حاضرهم.(9)

''استشراق ایک ایسا علم ہے جو مشرق کی زبانوں، علمی ورثہ، تہذیبوں، معاشروں، ماضی اور حال کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔''

تحریکِ استشراق کا آغاز

مستشرقین کی تحریک کا آغاز کب ہوا؟ اس سلسلے میں مختلف آراء ملتی ہیں:

چھٹی صدی تک مستشرقین کو اسلام اور مسلمانوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ صرف تجارتی تعلقات کی بنیاد پر مشرقی ممالک میں آتے تھے اور ان کے حالات، رسوم ورواج، تجارتی اشیاء اور عوام الناس کے رہن سہن کو جاننے یا سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کو قلم بند بھی کرتے تھے۔ اس میں ہیر دوس (Herodotus, c.484–425BC) نامی مورخ بہت مشہور ہوئے، جو مغرب میں 'بابائے تاریخ' (Father of History) کے نام سے معروف ہیں۔ انہوں نے عراق، شام، مصر اور جزیرۃ العرب کا سفر کیا اور وہاں کے حالات لکھے۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز سے ہی مستشرقین کی اسلام دشمنی کا آغاز ہو گیا تھا، مگر اس میں شدت اس وقت آئی جب صلیبی جنگیں ہوئیں اور مسلمانوں نے اپنے لیے ترقی کی

راہ ہموار کی۔اس پر محمد حسین ہیکل اپنی کتاب ''حیاۃ محمدؐ'' میں لکھتے ہیں:

> ''پیروان مسیحیت پر اسلام اور مسلمانوں کی یہ ترقی شاق گزری، نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور مسیحیت کے درمیان شدید اختلافات کی خلیج حائل ہوگئی اور اس نے باقاعدہ ایک کشمکش کی صورت اختیار کرلی۔''(10)

سب سے پہلے جان آف دمشق(John of Damascus,675-749) نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کا آغاز کیا۔اسلام کو وثنی (Pagan) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا۔اس نے اسلام مخالف دو کتابیں (محاورۃ مع المسلم ،ارشادات النصاریٰ فی جدل المسلمین) لکھیں۔(11) دوسرا شخص تھیو فانس بزانسی ہے جس کی کتاب کا نام ''زندگانی محمدؐ'' ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر نہیں تھے بلکہ آپ نے اسلامی تعلیمات کو شام کے یہودیوں اور عیسائی علماء سے حاصل کیا تھا اور آپ کے پیروکار بھی آپ کو مسیحِ موعود مانتے ہیں۔پھر جان آف دمشق کے دیگر پیروؤں نے ان ہی بنیادوں پر اسلام کے خلاف لٹریچر تیار کیا اور یہی ان کے لیے ازمنہ وسطیٰ سے لے کر مغربی نشاۃ ثانیہ اور پھر بیسویں صدی تک مرجع وماخذ بنے رہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کے نزدیک یہ تحریک دسویں صدی میں اس وقت شروع ہوئی جب بعض مغربی راہب اندلس پہنچے اور مسلم علماء کرام سے فلسفہ،طب اور ریاضی وغیرہ کا علم حاصل کیا۔مزید یہ کہ انہوں نے قرآن اور دیگر عربی کتابوں کا ترجمہ اپنی زبانوں میں کیا۔ان میں جربرٹ ڈی اوریلیک (Jerbert d' Aurillac,946-1003)(فرانسیسی راہب)، پطرس محترم (Peter the Venerable,1093-1156) اور جیراڈ گریمون (Gerard de Germone, 1114-1187) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔اول الذکر وہاں کی جامعات سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد 999 سے 1003 تک پوپ سلویسٹر ثانی(Pope Silvester II) کے نام سے پاپائے روم کے منصب پر فائز رہے۔(12)

بعض اہلِ علم کے مطابق اس کا آغاز 1269 میں ہوا جب قشتالہ (Castile) کے شاہ الفانسو دہم (King Alfonso, 1221-1284) نے 1269 میں مریسلیا (Murcia) میں اعلیٰ تعلیمات کا ایک ادارہ قائم کیا اور ابوبکر الرقوطی کی سربراہی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم،عیسائی اور یہودی علماء کو تراجم اور تصنیف وتالیف کا کام سونپا۔(13)

بعض حضرات کے نزدیک اس تحریک کا آغاز ''ویانا'' میں کلیسا کی کانفرنس (Council of Vienne, 1312) کے دوران ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ یورپ کی جامعات میں عربی، عبرانی اور سریانی زبان کی تدریس کے لیے پیرس اور یورپ کی طرز پر چیئرز قائم کی جائیں۔(14)

اے جے آربری (Arthur John Arberry, 1905-1979) کے مطابق استشراق (Orientalist) کا استعمال پہلی بار 1638 میں یونانی کلیسا کے ایک پادری کے لیے ہوا۔(15)

میکسم روڈنسن (Maxime Rodinson,1915-2004) کے مطابق استشراق کا لفظ انگریزی زبان میں 1838 میں داخل ہوا اور فرانس کی کلاسیکی لغت میں اس کا اندراج 1799 میں ہوا۔

اسی طرح بعض کے نزدیک اس تحریک کے بانی پطرس محترم (Peter The Venerable,1092-1156) تھے، جو ClunyFrance کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اسلامی علوم کے تراجم کے لیے مختلف علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس میں مشہور انگریزی عالم رابرٹ آف کیٹن (Robert Of Ketton,1110-1160) بھی تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کا پہلا لاطینی ترجمہ 1143 میں کیا، جس کا مقدمہ پطرس نے لکھا تھا۔ یہ پہلی بار 1543 میں شائع ہوا تھا۔

مستشرقین کی قسمیں

گزشتہ کئی صدیوں سے مختلف مستشرقین اسلام اور اس کی تعلیمات کے سلسلے میں تحقیق وتصنیف میں مشغول ہیں۔ ان کو نظریات وافکار اور فطرت کی بنیاد پر درج ذیل قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1-سلیم الفطرت مستشرقین

بعض سلیم الفطرت مستشرقین ایسے بھی تھے جنہوں نے اسلام کی آفاقی تعلیمات کو فطرت کے قریب پایا اور اسے آسمانی ہدایت سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِتسلیم خم کر گئے اور اسلام لے آئے۔ پھر ان کی پوری زندگی اسلام کے مطابق گزری اور انہوں نے مستشرقین کی جانب سے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا۔ جیسے:

(1) رسل ویب (Mohammed Alexander Russell Webb(1846-1916))

Books: 1.Why I Became a Muslim 2.An Outline of

Islamic Faith 3.The Five Pillars of Practice 4.Islam in Its Philosophic Aspect 5.Polygamy and the Purdah 6.Popular Errors Refuted 7.The Muslim Defensive Wars 8.The American Islamic Propaganda)،

(2)ابوبکر سراج الدین(Martin Lings,(1909-2005)

Books: 1.Muhammad:His Life Based On The Earliest Sources(1983) 2.Splendors of Qur'an Calligraphy And Illumination (2005)3.Mecca: From Before Genesis Until Now (2004).4 A Sufi saint of the twentieth century: Shaikh Ahmad al-°Alawi, his spiritual heritage and legacy (Islamic Texts Society, 1993)،

(3) شیخ عبداللہ کویلیام(William Henry Quilliam, 1856-1932)،

(4)ناصر الدین دینیہ (Alphonse-Etienne Dinet,(Nasreddine Dinet)1861-1929)،

(5)رحمت اللہ الفاروق(Lord Hadly Alfaruque,1855-1935)

(6)علامہ محمد اسد(Leopold Weiss,1900-1992)،

(7)ڈاکٹر عمر رالف ایرنفلس (Dr. Baron Omar Rolfvon Ehrenfels,1901-1980)،

(8)خالد شیلڈرک(Bertram William Sheldrake,1800)،

(9)مریم جمیلہ(Margaret Marks,1934-2012)وغیرہ۔

2-تحقیق وتصنیف کے شائق مستشرقین

مستشرقین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا بنیادی مقصد صرف علمی میدان میں تحقیق وتصنیف کرنا اوراس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچانا ہے۔ایسے لوگوں نے تیرہویں صدی کے بعد مشرق سے علم وادب کے ذخیرے کو ترجمہ کر کے مغرب میں پہنچایا۔ان کو اسلام سے کوئی دشمنی اور عداوت نہیں ہے بلکہ وہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے مسلمانوں کے مختلف مما لک کے علمی مراکز میں جا کر قرآن وحدیث ،فقہ،تاریخ اور دیگر علمی

کتابوں پر ریسرچ کرتے ہیں۔ان لوگوں نے مردہ اقوام کی گم شدہ تاریخ کی چھان بین کی۔آثارِ قدیمہ کی مدد سے ان کے قدیم رسوم ورواج، زبان وادب کا بغور مطالعہ کیا اور نتائج اخذ کیے۔اسلام وعربی لٹریچر کے تحفظ کے لیے بڑی کوششیں کیں اوراپنی علمی تحقیق کے نتیجہ میں سینکڑوں یادگار کتابیں مسلمانوں کو دی۔ان کتابوں میں ''نجوم الفرقان فی أطراف القرآن(1842) اور **المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی** (1936)''اہم ہیں۔اوّل الذکر کو ''فلوجل الألمانی'' (Gustav Leberecht Flugel, 1802-1870) نے لکھا تھا۔اس کتاب سے محمد فوادالباقی نے ''**المعجم المفهرس لألفاظ القرآن** '' لکھتے وقت استفادہ کیا تھا۔ثانی الذکر کے مؤلف الدکتور اُی.ونسک (A.J.Wensinck) ہیں۔دیگر مستشرقین میں البرٹ اعظم (Albert Azam, 1293-1335)،ریمنڈ لول (Reymond LOl,1235-1315)،میجل اسکاٹ (M.Scot)،گوستاؤلیبون (Gustave Le Bon, 1841–1931,The Crowd: A Study of the Popular Mind)،تھامس ایڈورڈ (Thomas Edwards,1652-1721,A Discourse against Extemporary Prayer) اورراجر بیکن (R.Bacon) وغیرہ مشہور ہوئے۔

3-اسلام دشمن اور تعصب پرست مستشرقین

مستشرقین کا یہ طبقہ ان متعصب یہودی اور عیسائی محققین پر مشتمل ہے،جن کا بنیادی مقصد صرف اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ان لوگوں نے اپنی زندگی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے عقائد ونظریات کے فروغ کے لیے وقف کردی اور مشرق سے جو بھی مفید چیزیں اخذ کی گئی ہیں ان کو علمی دیانت کے برخلاف،ان کے ماخذ ومصادر کو پوشیدہ رکھ کر انہیں مغرب سے منسوب کردیا۔ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بارود،قطب نما،الکحل،عینک اور دیگر بیسیوں اشیاء کے مؤجد تھے،لیکن بقول رابرٹ بریفالٹ مؤرخین یورپ نے عربوں کی ہر ایجاد اور انکشاف کا سہرا اس یورپی کے سر باندھ دیا ہے جس نے پہلے پہل اس کا ذکر کیا تھا۔مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک فرضی شخص فلویوگوجہ کی طرف منسوب کردی۔''ولے ناف کے آرنلڈ'' کو الکحل اور بیکن کو بارود کا موجد بنا دیا۔صرف یہی نہیں بلکہ بعض اوقات عربوں کی تصانیف پر اپنا نام بطور مصنف جڑ دیا۔انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لفظ جبیر (Geber) کے تحت ایک مترجم کا نام دیا

ہوا ہے، جس نے اسلام کے مشہور ماہر کیمیا داں جابر بن حیان کے ایک لاطینی ترجمے کو اپنی تصنیف بنالیا تھا۔ یہی حرکت سلرنو کالج کے پرنسپل قسطنطین افریقی (1060) نے بھی کی تھی کہ ابن الجزار کی ''زادالمسافر'' کا لاطینی ترجمہ "Viaticum" کے عنوان سے کیا اور اس پر اپنا نام بطور مصنف لکھ دیا۔'' (16)

4- مفاد پرست مستشرقین

مستشرقین کی یہ وہ قسم ہے جن کے پیشِ نظر کوئی اعلیٰ علمی مقاصد نہیں ہوتا، بلکہ وہ مادی مفادات، عہدوں، سستی شہرت اور دنیاوی مال و دولت کے لالچ میں اس میدان میں قدم رکھتے ہیں اور چوں کہ اہلِ مغرب مسلمانوں کے خلاف کی گئی تحقیق کو، چاہے وہ کتنی ہی غیر معیاری، بے بنیاد اور علمی وعقلی لحاظ سے پست ہی کیوں نہ ہو، ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اس وجہ سے ایسے لوگ ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اہل مغرب سے اپنے مفادات سمیٹ سکیں۔ اس طرح کے لوگوں میں ہندوستان کے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین وغیرہ بھی شامل ہیں۔

علمی معیار کے اعتبار سے مستشرقین کی اقسام

علامہ شبلی نعمانی نے علمی معیار کے اعتبار سے مستشرقین کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے:

1- عربی زبان وادب، تاریخ اسلام اور اس کے ماخذ سے ناواقف مستشرقین، جن کی معلومات براہ راست نہیں ہوتیں، بلکہ وہ اوروں کی تصنیفات، تراجم اور قیاسات ومفرضوں سے کام لیتے ہیں۔

2- وہ مستشرقین جو عربی زبان وادب، تاریخ، فلسفۂ اسلام سے تو واقف ہوتے ہیں، مگر مذہبی لٹریچر اور فنون مثلاً اسماء الرجال، روایت ودرایت کے اصولوں، قدیم ادب اور روایات سے واقف نہیں ہوتے۔

3- وہ مستشرقین جو اسلامی علوم اور مذہبی لٹریچر کا مطالعہ کر چکے ہوتے ہیں، لیکن اپنے مذہبی تعصّبات کو دل سے نہیں نکال سکے۔ وہ اسلامی علوم کے بارے میں تعصب، تنگ نظری اور کذب وافترا سے کام لیتے ہیں۔(17)

مستشرقین کے مقاصد

مستشرقین کے مقاصد زیادہ تر منفی ہیں اور یہ لوگ ان مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد اسلام اور اس کی تعلیمات کا صرف تحقیقی مطالعہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان تعلیمات کو شکوک

وشبہات سے دھندلا کرنا، مسلمانوں کو گم راہ کرنا اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی منفی تصویر پیش کر کے انہیں اسلام قبول کرنے سے روکنا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی تحریکِ استشراق کے مقاصد کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''اس تحریک کے بنیادی مقاصد اسلام کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا، عام مسلمانوں کو علماء کرام سے بدظن کرنا، مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنا، اسلامی تہذیب کی تحقیر و تذلیل کرنا، کتاب وسنت میں تحریف کرنا، عبارتوں کو غلط مفہوم میں پیش کرنا اور حسب خواہش قبول یا رد کرنا وغیرہ تھے۔'' (18)

اس کے علاوہ ان کے چند بڑے مقاصد درج ذیل ہیں۔

1- مسیحیت کی تبلیغ واشاعت

اسلام انتہائی سرعت سے عرب کے علاقے سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا تھا اس لیے یہود ونصاریٰ کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر اسلام اسی رفتار سے پھیلتا رہا تو ایک دن ان کے دین کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو انھوں نے سوچا کہ ایک طرف اسلامی تعلیمات میں شکوک وشبہات کے بیج ڈالے جائیں اور اسے ناقص اور ناکام قرار دیا جائے۔ دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے سے روکا جائے اور تمام دنیا میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی جائے۔

اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے انھوں نے پادریوں کی تربیت کی اور مسلم ممالک سے اسلامی علوم کی کتابیں جمع کر کے ان میں سے ایسی کمزوریاں تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا جا سکے۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، خاندان، ازواج، قرآن مجید، نزول وحی، احکام، احادیث، فقہ، سیرت صحابہ، غلامی اور جہاد وغیرہ کو ہدف بنایا اور ان میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان موضوعات پر باقاعدہ کتابیں لکھی گئیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں میں اتحاد اور اخوت کو ختم کر کے ان میں مختلف نسلی، لسانی اور علاقائی تعصّبات کو ابھارنا چاہا۔

اسلام کی مخالفت انہوں نے اس لیے بھی کی کہ عوام میں یہ تاثر دیا جا سکے کہ مسیحیت ہی واحد صحیح دین ہے اور اسلام اس کا شدید دشمن ہے۔ امتِ مسلمہ ایک وحشی قوم ہے جس میں صرف جسمانی ونفسانی خواہشات پر توجہ دی جاتی ہے اور اس کا کوئی اخلاقی وروحانی نظام نہیں ہے۔

2-اقتصادی ومعاشی استحکام

اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک کی سائنسی وتکنیکی مہارت حاصل کرنے، اپنے معاشی مفادات اور تجارتی معاملات کو بہتر بنانے کے لیے عربی زبان اور اسلامی تہذیب وثقافت کا مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی ان لوگوں نے تجارتی ومعاشی طور پر بھی مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہا اور تجارت کے نام پر ان کے قدرتی ذخائر سے خام مال کو کم سے کم قیمت پر خریدا تا کہ ان کی معیشت کمزور ہو جائے اور وہ ترقی نہ کرسکیں۔ اس سلسلے میں ہر قسم کے غیر اخلاقی حربے استعمال کیے گئے اور آزادی، انصاف اور رحم ومروت کے تمام اصولوں کو فراموش کر دیا گیا۔ جس کا اعتراف ایک انگریز ادیب ''سڈنی لو' (Sir Sidney James Mark Low,1857–1932) نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''مغرب کی عیسائی حکومتیں کئی سالوں سے امم شرقیہ کے ساتھ جو سلوک کررہی ہیں اس کی وجہ سے یہ حکومتیں چوروں کے اس گروہ کے ساتھ کتنی مشابہت رکھتی ہیں جو پرسکون آبادیوں میں داخل ہوتے ہیں، ان آبادیوں کے کمزور مکینوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کا مال واسباب لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ یہ حکومتیں ان قوموں کے حقوق پامال کررہی ہیں جو آگے بڑھنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ اس ظلم کی وجہ کیا ہے جو ان کمزوروں کے خلاف روا رکھا جا رہا ہے۔ کتوں جیسے اس لالچ کا جواز کیا ہے کہ ان قوموں کے پاس جو کچھ ہے وہ ان سے چھیننے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ عیسائی قوتیں اپنے اس عمل سے اس دعویٰ کی تائید کررہی ہیں کہ طاقت ور کو حق پہنچتا ہے کہ وہ کمزوروں کے حقوق غصب کریں۔'' (19)

3-سیاسی واستعماری استحکام

اہلِ مغرب اور مستشرقین نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے صلیبی جنگوں کا بھی سہارا لیا جس کی وجہ سے مجموعی طور پر دس صلیبی جنگیں (1099-1464) ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے شمالی افریقہ میں اپنی کالونیاں بسائیں اور ان پر اپنا تسلّط قائم رکھنے کے لیے سفارت خانوں کے بہانے سے مختلف مراکز بنائے جو بعد میں سیاسی امور میں بھی مداخلت کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے وہاں کی تاریخی وجغرافیائی حالات، عادت واطوار، رہن سہن، اخلاق وکردار اور عقائد وافکار کا مطالعہ کیا اور ان کمزور پہلوؤں کو تلاش کیا کہ جہاں سے انہیں نشانہ بنایا جا سکے۔ مستشرقین میں سے بلاشر (Régis Blachère,1900–1973)، نولڈکے (Theodor

Das Nöldeke,1836–1930, Leben Mohammeds (1863) ویلام اور مکیسون اس قسم کے اہداف کے علم بردار ہیں۔

مستشرقین کو خطرہ اس بات کا تھا کہ اگر اسلام ایک بڑی طاقت بن کر اس دنیا میں اُبھر جائے تو ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو مختلف چھوٹے چھوٹے ملکوں اور ٹکڑیوں میں تقسیم کیا جائے۔اس طرح سے بعض استعماری مما لک جیسے روس،فرانس،اٹلی،امریکہ اور برطانیہ نے مسلم مما لک کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لیے۔

جرمن مفکر پال اشمید (Paul Schmidt) نے اپنی کتاب میں تین چیزوں کو مسلمانوں کی شان وشوکت کا سبب قرار دیتے ہوئے ان پر قابو پانے اور ختم کرنے کی کوششوں پر زور دیا ہے:

1- دین اسلام،اس کے عقائد اور اس کے نظامِ اخلاق میں مختلف نسلوں،رنگوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو 'رشتۂ اخوّت' سے استوار کرنے کی صلاحیت۔

2- مما لک اسلامیہ کے طبعی وسائل۔

3- مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی عددی قوت۔

چناں چہ وہ مسلمانوں کی قوت وطاقت کی اصل بنیادوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ تینوں قوتیں جمع ہوگئیں،مسلمان عقیدے کی بنا پر بھائی بھائی بن گئے اور انھوں نے اپنے طبعی وسائل کو صحیح صحیح استعمال کرنا شروع کر دیا،تو اسلام ایک ایسی مہیب قوت بن کر ابھرے گا جس سے یورپ کی تباہی اور تمام دنیا کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔''(20)

4- علمی استحکام

اہلِ مغرب اور مستشرقین کو اپنے سابقہ تجربات کی بنیاد پر علم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو جنگ وجدال کے ذریعے سے ختم کرنا،ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے۔اس لیے انھوں نے اب اپنے منصوبوں میں تبدیلی کی اور تعلیم کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں پر حملے شروع کیے۔اس کے لیے انھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔

ایک طرف اپنے اہلِ علم کو مسلمانوں کے علوم وفنون سیکھنے پر لگایا تو دوسری طرف مسلمانوں میں ان

کے افکار ونظریات کو دھندلانے کی کوشش کی ۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے قرآن و حدیث،فقہ اور تاریخ وغیرہ کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔اس میں ان لوگوں نے تحریف وتبدیل سے کام لیا،ان کو مختلف ماہ ناموں،میگزینس اور اخبارات ورسائل(ایشین میگزین(Asian Magazine,1787)، **مجلة الجمعية الآسيوية المكية** (1843)،**الجمعية الشرقية الأمريكية** (1844)،العالم الاسلامی(The Muslim World,1911) میں شائع کرایا۔مختلف جگہوں پر کانفرنسیں منعقد کیں اور مختلف انسائیکلوپیڈیاز (The Encyclopaedia Of Islam(First Edition 1913-1938),Shorter Encyclopaedia Of Islam,Encyclopaedia Of Religion And Ethices By James Hastings(12 (15 Encyclopaedia Of Social Sciences Volumes,1908-1927), Volumes,First Edition 1930) etc.) تیار کیں اوران سب کو'اسلامک اسٹڈیز' کے تحت رکھا گیا۔ یہ نام بھی مغرب ہی کا دیا ہوا ہے۔

مستشرقین نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے حکومتوں کی مدد سے سوسائٹی، اسکول ،کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔جن میں اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم دی جاتی ہے اور تحقیق وتصنیف کا بھی کام ہوتا ہے۔سب سے پہلے ہالینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر شرقی میں ایک 'ایشیاٹک سوسائٹی'(1778) کی بنیاد ڈالی۔اس کی تقلید میں انگریزوں نے' کلکتہ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی'(1784) اور بنگال میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی(1788) کی بنیاد ڈالی ۔لندن میں 'رائل ایشیاٹک سوسائٹی' قائم ہوئی ۔ارکانِ حکومت فرانس نے 1795 میں 'زندہ السنہ مشرقیہ' (عربی، فارسی اور ترکی) کے لیے ایک درس گاہ قائم کی ۔اس صدی میں

ایڈورڈ ویلیم لین(Edward William Lane,1801-1876)،

ایڈورڈ ہنری پامر (Edward Henry Palmer,1840-1882)

اور سر رچرڈ برٹن(Sir Richard Francis Burten,1821-1890)وغیرہ مشہور ہوئے۔

یورپ میں بھی مستشرقین نے اسلام کو سمجھنے کے لیے'اسلامک اسٹڈیز' کے مختلف انسٹی ٹیوٹ،سینٹرس

اور مراکز قائم کیے۔ جیسے

United States:

(Oriental Institute, Chicago, part of the University of Chicago).

England:

(Oriental Institute, Oxford, part of the University of Oxford).

Continental Europe:

1. Oriental Institute in Sarajevo, a research institute in Sarajevo,Bosnia.

2. Oriental Institute, ASCR, part of the Academy of Sciences of the Czech Republic in Prague.

3. Pontifical Oriental Institute, a Roman Catholic university in Rome, Italy.

4. Institut national des langues et civilisations orientales, Paris, France.

Asia:

1. Oriental Institute, Maharaja Sayajirao University of Baroda, India.

2. Cama Oriental Institute, Mumbai, India.

3. Oriental Institute (Vladivostok), part of the Far Eastern Federal University,Russia)

اس کے علاوہ

ہارورڈ یونیورسٹی (Harward University)، کولمبیا یونیورسٹی (Columbia University)، جان ہاپکنس یونیورسٹی (John Hopkins University)، شکاگو یونیورسٹی (Chicoago University)، میشی گن یونیورسٹی (Michigun University)، بفیلو یونیورسٹی (Buffallo University)، کیلیفورنیا یونیورسٹی (California University)، ٹورنٹو یونیورسٹی (Toronto University)، میک گل یونیورسٹی (Mcgill University)، برلن یونیورسٹی (Berlin university)، نیویارک یونیورسٹی (New Yourk University)، برسولونا یونیورسٹی (Bacelona University)، ٹیمپل یونیورسٹی (Temple university)، انڈیانا یونیورسٹی (Indiana University)، ڈیوک یونیورسٹی (Duke University)، لندن یونیورسٹی (London University)، کیمبرج یونیورسٹی (Cambridge University)

(University، اڈنبرہ یونیورسٹی (Adenbra University)، گلاسکو یونیورسٹی (Glasco University) ، آکسفورڈ یونیورسٹی(Oxford University)، لیدن یونیورسٹی (Leedon University)، ڈنمارک یونیورسٹی(Denmark University) اور یوٹی اے ایچ یونیورسٹی (U.T.A.H University) وغیرہ مشہور ہیں جہاں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم ہیں اور ان میں مستشرقین کے ذریعے تحقیق وتصنیف کا کام ہوتا ہے۔

مستشرقین نے اسلامی وتاریخی کتابوں کی نشرواشاعت بھی شروع کی تاکہ ان کے افکارونظریات تیزی سے دنیا میں پھیل سکیں۔ پہلی مرتبہ اٹلی کے 'باتیتیتا یا باتیتا' نامی فرد نے چھاپہ خانہ کی بنیاد 1568 میں ڈالی۔ عربی کتابوں کی نشرواشاعت پر خاص توجہ دی گئی۔ ابن سینا کی اہم ترین کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کی نشرواشاعت کا مقصد دین اسلام کو کلیساؤں میں تعارف کرانا اور اس کے ذریعہ اسلام کا مقابلہ کرنے کی راہ ڈھونڈنا، مسلمانوں کی غیر معتبر کتابوں کو نشر کرنا، مسلمانوں کی مفید کتابوں سے فائدہ اُٹھانا اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور تفرقہ پیدا کرنا، خصوصاً قراءت قرآن کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف نظریوں کو اچھال کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑانا تھا۔

مشہور مستشرقین اور ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(1) اے جے اربیری(Arthur John Arberry,1905-1969):
'دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، الاسلام الیوم، مقدمۃ لتاریخ التصوف، التصوف اور ترجمۃ القرآن'

(2) الفرڈ جیوم(A.Geom): الاسلام

(3) بیرن کارڈی ووکس(Baron Carrade Vaus): انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

(4) ایچ اے آر گب (Hamilton Alexander Rosskeen Gibb, 1895-1971): 'طریق الاسلام، الاتجاہات الحدیثۃ فی الاسلام، الاسلام والمجتمع الغربی'۔

(5) گولڈزیہر(Gold Zihar): انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تاریخ مذھب التفسیر الاسلامی

(6) ایس ایم زویمر (S.M.Zweimer): رسالہ العالم الاسلامی، الاسلام تحد لعقیدۃ الاسلام

(7) جی فون گرنبم (G.Von.Grunbaum): اسلام العصور الوسطیٰ، الاعیاد المحمدیۃ، محاولات فی شرح الاسلام المعاصر، دراسات فی تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ، الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیۃ

(8) فلپ ہٹی (Philip Khuri Hitti,1886-1978): تاریخ العرب، تاریخ

سوریا،أصل الدروز ودیانتھم

(9)لوئی میسگن (Louis Massignon,1883-1962):الحلاج الصوفی الشہید فی الاسلام،انسا ئیکلوپیڈیا آف اسلام

(10)ڈی بی میکڈونلڈ (D.B.Macdonald):انسا ئیکلوپیڈیا آف اسلام،تطور علم الکلام و الفقہ والنظریۃ الدستوریۃ فی الاسلام،الموقف الدینی والحیاۃ فی الاسلام

(11)ڈی ایس مرگولیوتھ (David Samuel Margoliouth,1858-1940): انسائیکلوپیڈیا آف اسلام،التطورات المبکرۃ فی الاسلام،محمد ومطلع الاسلام،الجامعۃ الاسلامیۃ

(12) آر اے نیکلسن (Reynold A.Nicholson,1868-1945):انسا ئیکلوپیڈیا آف اسلام،التاریخ الأدبی للعرب

(13)ہنری لیمنز (Henni Lammens,1862-1937):انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، الاسلام،الطائف

(14)ولیم بڈول(William Bedweul,1561-1632):عربی لغت

(15)ایڈورڈ پوکاک(Edward Pococke,1604-1691):عربوں کی تاریخ کا نمونہ(خلاصہ تاریخ ابوالفرج)

(16) سرولیم جونس(Sir William Jones,1746-1794):انگلش ترجمہ سبع معلقات

(17)ایڈورڈ سعید(Edward Said,1935–2003):Orientalism(1978) وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔

مراجع ومصادر

۱۔ ابن منظور الافریقی،محمد بن مکرم،لسان العرب،دارصادر، بیروت،10/174

The Oxford Dictionary of English, The biologolical Society, V.2 Page,200.(2)

Word Web (Sofware Dictionary)Word"Oreientalism".(3)

(4)Said, Edward W, Orientalism, Routedge & Kegan Paul London, 1978 p.21

۵۔ محمد،اسمٰعیل علی،الاستشراق بین الحقیقۃ و التضلیل،دارالکلمۃ للنشر والتوزیع،القاھرۃ،الطبعۃ السادسۃ،

2014،ص13
۶۔ المنجد فی اللغۃ والاعلام،طبع الثالثۃ والعشر ون،المکتبۃ الشرقیۃ، بیروت، لبنان،ص384
۷۔ غراب،احمد عبدالحمید ،رویۃ اسلامیۃ للاستشراق،مؤسسۃ دار الأصالۃ للثقافۃ والنشر والأعلام، الریاض، 1988، ص09
۸۔ ناجی،عبدالجبار،تطورالاستشراق فی دراسۃ التراث العربی،دارالجاحظ،عراق، 1981،ص23
۹۔ فوزی، فاروق عمر،الاستشراق والتاریخ الاسلامی،الاھلیۃللنشر والتوزیع، لبنان،الطبعۃ الاولی،1998،ص30
۱۰۔ ہیکل،محمد حسین،حیاۃ محمد،مکتبۃ نہضۃ المصریہ،القاہرہ،1974،ص02
۱۱۔ دیاب،محمد احمد،اضواء علی الاستشراق والمستشرقین،دارالمنار،القاہرۃ،1989،ص15
۱۲۔ السباعی،مصطفیٰ،الاستشراق والمستشرقون (مالھم وما علیھم)،دارالوراق ،المکتب الاسلامی، القاہرۃ،صفحات 17-18
۱۳۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین،ص14
۱۴۔ زقزوق،محمود حمدی،الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃللصراع الحضاری،دارالمعارف،القاہرۃ،1989،ص25
۱۵۔ الفیومی،محمد ابراہیم ،الاستشراق رسالۃ استعمار:تطور الصراع الغربی مع الاسلام،دارالفکرالعربی، القاہرۃ، 1993،ص142
۱۶۔ غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسانات،شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور،صفحات 27-28
۱۷۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، آرزیڈ پیکجز، لاہور، 1408ھ:70-1/69
۱۸۔ السباعی،مصطفیٰ،السنہ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی ،مترجم غلام احمد حریری، ملک سنز پبلشرز، فیصل آباد، 2006ء،صفحات 466-467
۱۹۔ الجبری،عبدالمتعال محمد،الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری،مکتبۃ وھبۃ ،القاہرۃ،1995،ص108
۲۰۔ محمد الدھان،قوی الشر المتحالفہ وموقفھا من الاسلام والمسلمین،القاہرۃ،1988،ص24

قرآن اور مستشرقین

آسیہ خاتون

استشراق اور مستشرقین کا موضوع اپنی غیر معمولی اہمیت اور وسعت کے باوجود کسی وسیع علمی معیار پر ہمارے مصنفین کے زیر بحث نہیں رہا۔ حالانکہ اس بات کی ضرورت پہلے بھی مسلم تھی اور آج بھی روز بروز بڑھتی جارہی ہے کہ علم الاستشراق کی تاریخ، کردار، مقاصد اور کھرے کھوٹے پر بے لاگ تبصرہ اور تنقید ہو۔ اور دنیا کے سامنے تصور کا صحیح رخ پیش کیا جائے۔ کیوں کہ لوگوں کے دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بے زاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی ہے۔ اسلام اور اسلامی ماخذ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ ان علماء مغرب کا ہے جنہوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں اور جو اصلاح مذہب اور اصلاح قانون اسلامی کے لیے شدومد سے کوشاں رہے۔ ان کو عام طور پر مستشرقین(Orientlist) کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتب میں محفوظ ترین کتاب ہے لیکن مستشرقین کی ایک بڑی تعداد اس کتاب عظیم کو دیگر تحریف شدہ کتب کے ہم پلہ کتاب ثابت کرنے کے درپے رہی ہے۔ مشرق کے مسلمان علماء اور مستشرقین میں کتاب اللہ کی محفوظیت کے کئی اہم امور پر زبردست اختلاف رہا ہے اور مستشرقین نے اس ضمن میں اختلاف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ہم صدر اسلام کے یہود ونصاریٰ جنہوں نے اسلام کے خلاف اعتراضات کے انبار لگادیے ان کو بھی مستشرق قرار دے سکتے ہیں۔ خاص طور سے صلیبی جنگوں کا زمانہ عیسائی علماء اور محققین کا اسلامی معتقدات کا رد، آپؐ کے اسوہ کامل کو گہنا دینے اور قرآن کریم کو آپؐ کی تخلیق ثابت کرنے کی مساعی کا اہم دور ہے۔ یوں تو مستشرقین نے اسلامی ورثہ سے متعلق مخطوطات کی نصوص کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کے سب

ہی پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ اسلام، تصوف، عربی زبان اور ادب شامل ہیں۔ مستشرقین نے خاص طور پر قرآن کریم اور آپ ؐ کی ذات گرامی کو موضوع بنایا ہے۔ قرآن کریم کے بارے میں سب ہی قدیم اور جدید مستشرقین نے قلم اٹھایا ہے۔ تقریباً سب ہی نے قرآن کی موجودہ ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اپنے طور پر قرآنی سورتوں کی ترتیب نزولی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ٹوری آف ییل (Torry of Yall) نے کتاب اللہ میں تضادات ڈھونڈنے کے لیے اپنی عمر کھپائی۔ نولڈیکے (Noledeke) کی 'تاریخ القرآن' قرآن پر اعتراضات کے حوالے سے مستشرقین کا اہم مصدر ہے۔

قرآن پر اعتراضات کے حوالے سے آرتھر جیفری Arthur Jeffery ایک آسٹریلوی نژاد امریکی مستشرق مشہور ہے۔ اس نے اپنی تحقیق کا موضوع قرآن کو بنایا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ قرآن آپ ؐ کی تصنیف ہے اور جوں جوں آپ کی سوچ میں ارتقاء ہوتا گیا تو اس اعتبار سے آپ ؐ قرآن مرتب کرواتے رہے۔ جیفری کی سب سے مشہور کتاب جو اس نے اسلام اور قرآن پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا ہے وہ Materials for the History and Tert of the Quran ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس نے ۳۵ سال قرآن مجید پر اعتراض ڈھونڈنے میں لگائے۔ جیفری نے قرآن پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے: ''قرآن اسلامی صحیفہ ہے۔ اسے قرآن عظیم اور قرآن مجید وغیرہ ناموں سے تو پکارا جاتا ہے لیکن اسے Holy Quran یعنی قرآن پاک نہیں کہا جاتا۔ کچھ جدید دور کے مغرب کے تعلیم یافتہ مسلمان Holy Bible کے لقب کی نقل کر کے قرآن کو بھی Holy Quran یعنی قرآن پاک کہتے ہیں۔ یہ کتاب محمد ؐ کے بیس سال دور نبوت کے بیانات کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ محمد ؐ ایک ایسی کتاب کی تیاری میں مصروف تھے جو مسلمانوں کے لیے وہی حیثیت رکھے جو یہودیوں کے لیے عہد نامہ قدیم اور عیسائیوں کے لیے عہد نامہ جدید کی ہے لیکن اس کتاب کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہو گئے اور آج قرآن میں جو کچھ ہے یہ وہ ہے جو ان کے بعد ان کے پیروکاروں نے جمع کیا اور اسے محمد ؐ کے الہامات کے مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔ (قرآن حکیم اور مستشرقین، ثناء اللہ حسین)

ایک دوسرا مستشرق ریجس بلاشر (Regis Blacher) جو فرانسیسی مستشرق ہے اس نے ۱۹۵۶ء میں The Quran نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے علاوہ اس نے فرانسیسی زبان میں

Introduction all Coran جو قرآن مجید کا مقدمہ ہے لکھا ہے۔ یہ مقدمہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں اس نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام پر یہودیت کا بہت اثر تھا۔ اور آپ ان سے متاثر ہو کر اپنے دین اسلام کے لیے ایک کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے پس آپ نے اپنے متبعین کے لیے ایک کتاب تیار کی، جس کی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں نظر ثانی کی گئی۔ (اسلام اور مستشرقین، ڈاکٹر حافظ محمد زبیر) بلاشر کا یہ مقدمہ قرآن مجید اور اسلام پر الزامات و اعتراضات سے بھرا پڑا ہے۔

آرتھر جان آربری ایک برطانوی مستشرق ہے۔ اس کی شہرت کی وجہ اس کا انگریزی ترجمہ قرآن The Koran Interpreted ہے۔ اس میں اس نے سورۂ یوسف میں لفظ احلام کا ترجمہ خواب کے بجائے خوف ناک خواب کیا ہے۔ جو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح سورۃ الواقعۃ کا ترجمہ Teror کیا ہے جب کہ صحیح ترجمہ The Tnevitable Event تھا۔ ڈاکٹر ہشیم بن عبدالعزیز نے اپنے کتابچے دراسۃ الترجمہ معانی القرآن الکریم میں آربری کے ترجمے کی لغوی نحوی اور ابلاغی اغلاط کا احاطہ کیا ہے۔ باوجود یہ کہ مستشرقین کے تراجم قرآن مجید میں سے یہ بہترین ترجمہ شمار ہوتا ہے۔ (اسلام اور مستشرقین)

تمام مستشرقین نے آپؐ کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے جبرائیلؑ کے ذریعہ قلب مصطفیٰؐ پر نازل ہوا (وَقُرْآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلاً: بنی اسرائیل:١٠٦) ''اور قرآن کریم کو ہم نے متفرق طور سے اس لیے اتارا تا کہ آپؐ اسے لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔'' مستشرقین آپؐ کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے اور اس پر مختلف طرح سے اعتراضات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مستشرقین کے ان تمام اعتراضات کا جواب مسلم علماء نے دیا ہے۔ لہٰذا مسلم علماء خاص طور سے دارالمصنفین، اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء، لکھنؤ نے اس قسم کی کتابوں کا جائزہ لیا اور اس کا جواب دیا ہے۔ بلاشبہ مسلم علماء کرام کی ان مخلصانہ اور انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مستشرقین کے اسلام پر جارحانہ حملوں میں وہ جان نہیں رہ گئی۔ اب وہ صرف پرانے ہتھکنڈوں کو دوبارہ آزمانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی حقیقی علماء کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی۔

یک روزہ سمینار

بمقام: ابواللیث ہال، بتاریخ ۳۱/اگست ۲۰۱۹ء بروز سنیچر

بعنوان

اسلام اور مستشرقین

زیر اہتمام

جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ

قرآن کے باب میں اہم مستشرقین کا تعارف

محمد انوار القمر

(۱) تھیڈ ونولڈ یکے (Theodor Noldeke)

تھیڈ ونولڈ یکے ایک جرمن مستشرق تھا۔اس کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں ہوئی۔اس نے ۱۸۵۶ء میں 'تاریخ قرآن' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کا یہ مقالہ اس کے شاگرد فری ڈرش شوالی نے پہلی مرتبہ ۱۸۶۰ء میں جرمن زبان میں شائع کیا۔ جب کہ اصل مقالہ لاطینی زبان میں لکھا گیا تھا، اس کے بعد یہ مقالہ The History of the Quran کے نام سے انگریزی زبان میں شائع ہوا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلی جلد ۱۹۰۹ اور دوسری ۱۹۱۹ اور تیسری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید سے متعلق نولڈ یکے کے خیالات ۱۸۹۱ء میں انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں "The Quran" کے نام سے ایک آرٹیکل کی شکل میں شائع ہوئے۔

موصوف کو جرمن مستشرقین کا ''شیخ'' (Leader) بھی کہا جاتا ہے۔ وہ یونیورسٹی سٹراسبرگ میں مشرقی علوم کا استاذ رہا ہے۔ نولڈ یکے کو عبرانی کے علاوہ یونانی، سریانی اور عربی زبان پر بھی خاصا درک حاصل تھا۔

''نولڈ یکے کا خیال ہے کہ قرآن مجید حضرت محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف ہے اور وحی آپؐ سے ایک بے قابو ہیجانی حالت میں صادر ہوتی تھی۔اس نے یہ بھی کہا کہ وحی کا تجربہ آپؐ کا ذاتی تجربہ تھا نہ کہ آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا تھا۔ شخصی طور پر آپ نڈر اور بے باک تھے، غار حرا کی ریاضتوں نے آپؐ کے دماغ کو مزید جلا بخشی، مزید یہ کہ آپؐ کو اپنے مخالفین سے چڑ تھی۔ان حالات میں آپؐ پر ہیجانی کیفیت طاری ہوتی اور وحی کا نزول ہوتا ہے۔''(۱)

کتاب کی پہلی جلد میں بنیادی طور پر یہی بات کہی گئی ہے۔بعض مباحث مکی اور مدنی سورتوں کے اسلوب پر ہے۔

دوسری جلد دورنبوی ﷺ اور خلفائے ثلاثہ کے دور میں تدوین قرآن سے متعلق ہے۔نولڈیکے اس بات کا قائل ہے کہ قرآن مکمل طور سے جمع نہیں ہوسکا۔

تیسری جلد میں قرأت اور رسمِ عثمانی کے متعلق کچھ مباحث ہیں۔اس کے خیال کے مطابق رسم عثمانی میں بہت ساری غلطیاں موجود ہیں۔(۲) نولڈیکے قرآن مجید کے بارے میں اہل تشیع اور عیسائیوں کے اعتراضات سے متاثر لگتا ہے،اس لیے اس نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

تھیڈ ونولڈیکے کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔

(۲) پروفیسر اجناس گولڈزیہر (Prof. Ajnas Gold Zhir)

گولڈزیہر کی پیدائش ۲۲ جون ۱۸۵۰ء میں ہوئی۔گولڈزیہر کو لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا بڑا شوق تھا، بچپن ہی میں مذہبی کتب، عہد نامہ عتیق اور تلمود پڑھ لی تھی۔طالب علمی کے زمانے ہی میں فلسفہ اور فارسی وترکی زبانوں میں کافی درک حاصل کرلیا تھا۔حکومت کی طرف سے ایک تعلیمی وظیفہ حاصل ہوا اور جرمنی تحصیل علم کے لیے چلے آئے۔برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس وقت اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی۔جرمنی سے وہ ہالینڈ گیا اور وہاں اس نے خصوصی طور پر اسلامیات کا مطالعہ شروع کیا۔پھر اس نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور دمشق اور قاہرہ میں تقریباً ایک سال ۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۴ء قیام کیا۔اسی اثنا میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔پھر اسے قاہرہ کا قیام ترک کرنا پڑا اور وطن لوٹ آیا۔اس نے یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا،جس کو مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ تک کرتا رہا۔پھر ۱۹۰۴ء میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر تقرر ہوا، یہاں وہ سامی زبانوں اوران کی ادبیات کا پروفیسر رہا۔۱۹۱۴ء میں فیکلٹی آف لاء کے تحت اسلامی فقہ کا صدر شعبہ ہوگیا۔

گولڈزیہر کے بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔اسلامیات میں اس کی درج ذیل کتابیں مشہور ہیں:

(۱) فرقہ ظاہریہ: ان کا مذہب اوران کی تاریخ۔۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔

(۲) اسلامیات کا مطالعہ (دوجلدیں)

(۳)اسلامی دینیات اور قانون

(۴)مذاہب التفسیر الاسلامی

گولڈزیہر نے قرآنیات سے متعلق ''مذاہب التفسیر الاسلامی'' نامی جو کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں اس نے تمام مذاہب تفسیر کا استیعاب واستقصا نہیں کیا ہے۔ مزید یہ کہ دینی عواطف وجذبات کی ترجمانی کرنے میں گولڈزیہر سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نعوذ باللہ، اللہ کے رسول نہیں تھے، اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ حضرت محمد ﷺ کی تصنیف کردہ کتاب ہے۔(۳)

گولڈزیہر کا یہ الزام ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کے سفر میں ''عہد نامہ عتیق'' کی روایتیں سنیں اور پھر قرآن مجید میں ان کو دہرادیا۔ لیکن جب آیت وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ یَأْتِیْ مِن بَعْدِیْ اسْمُہُ أَحْمَدُ(۴) نازل ہوئی تو آیت کو منطبق کرنے کے لیے آپ کا نام بدل دیا گیا اور بجائے **قثم یا قثامہ** کے محمد نام رکھا گیا۔

اس تحقیق انیق کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ آپ کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ آپ کے دادا عبدالمطلب نے محمد نام رکھنے سے پہلے عبدنام تجویز کیا تھا۔ اس روایت کو مستشرقین نے کہیں سے کہیں پہنچادیا۔(۵)

پروفیسر گولڈزیہر کی وفات ۱۳؍نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔

(۳)ولیم کلیر ٹسڈ ال(William Clair Tisdall)

ٹسڈ ال کی پیدائش ۱۸۵۹ء میں ہوئی اور یہ برطانوی مستشرق تھا۔ اس نے عربی، فارسی، ہندی، پنجابی زبانیں سیکھیں۔ ایران میں قائم مشنری سوسائٹی کا چرچ آف انگلینڈ کی طرف سے سکریٹری رہا۔ قرآن مجید پر اس کی دو کتابیں ہیں:

۱- The Original Sources of The Islam۔: یہ ۱۹۰۱ء میں اسکاٹ لینڈ سے شائع ہوئی۔

۲- The Original Sources of the Quran: یہ ۱۹۰۵ء میں نیو یارک سے

شائع ہوئی۔

ان کتابوں کی اشاعت پر جب بعض علمائے کرام نے ان کا رد لکھا تو جواب میں ٹسڈ ال نے ایک کتاب اور لکھی جس کا نام: A word to the wise, being a brief of the source Islam ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں لکھنو، مدراس اور کولمبو سے شائع ہوئی۔

کلیر ٹسڈ ال کی کتاب The Original Sources of the Quran یعنی ''قرآن کے اصلی مصادر'' کا اردو ترجمہ نیاز فتح پوری نے اپنے رسالہ ماہنامہ نگار جنوری ۱۹۴۵ میں شائع کیا اور علمائے اسلام کو دعوت دیا کہ وہ اس کا جواب لکھیں۔

موصوف کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید وحی الٰہی یا آسمانی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب دور جاہلیت، عرب کے قدیم مذاہب، عیسائیت، یہودیت، صابیت، حنیفیت اور دین زرتشت کے افکار، عقائد اور تعلیمات کا ملغوبہ ہے۔(٦)

ولیم کلیر ٹسڈ ال کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔

(۴) آرتھر جیفری (Arthur Jeffery)

آرتھر جیفری کی پیدائش ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ کنیڈین نژاد آسٹریلین مستشرق تھا۔ یہ کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں سامی زبانوں (Semitic Language) کا پروفیسر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے اسلامی مخطوطات کو اس نے اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا۔ قرآن مجید پر اس نے بہت ساری کتابیں تحریر کیں، اس کی دو اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

۱- The foreign vocabulary of the Quran

۲- Materials for the History of the Text of the Quran

علاوہ ازیں اس نے قرآن سے متعلق بعض مقالات بھی لکھے ہیں۔ آرتھر جیفری کی تمام کتابوں اور قرآن سے متعلق مقالہ جات کا مرکزی خیال تقریباً ایک ہی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بائبل کی طرح قرآن مجید بھی کوئی مستند مذہبی کتاب نہیں ہے۔

موصوف کا کہنا یہ ہے کہ قرآن عہد نبوی میں تحریری صورت میں موجود نہیں تھا۔ جیفری نے اپنے اس موقف کی بنیاد جس روایت کو بنایا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

قبض رسول الله ولم يكن القرآن جمع في شيء. (۷)

''اللہ کے رسولؐ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ قرآن مجید کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔''

اس روایت میں قرآن مجید کے ایک جگہ جمع ہونے کا مسئلہ ہے نہ کہ کتابت کا، لہٰذا آرتھر جیفری کا استدلال درست نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید ایک کتاب کی شکل میں 'بین الدفتین' (Between vovers) جمع نہیں کیا گیا بلکہ متفرق اجزاء کی صورت میں لکھا ہوا تھا۔ صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ آپؐ کی زندگی میں قرآن مجید لکھا کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت قتادہؓ نے انس بن مالکؓ سے سوال کیا:

من جمع القرآن على عهد النبیﷺ قال: اربعة كلهم من الانصار: ابی بن کعب و معاذ بن جبل و زيد بن ثابت و ابوزيد(۸)

''اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں کس نے قرآن مجید جمع کیا؟ انس بن مالک نے جواب دیا: چار لوگوں نے اور وہ چاروں انصاری ہیں: ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید۔''

آرتھر جیفری کا کہنا ہے کہ نبیؐ پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ آخری عمر میں ایک کتاب تحریر کر دیں۔ آپؐ ایک تاجر تھے اور کاروباری امور لکھتے تھے۔ اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ چوں کہ قرآن عہد نبوی میں تحریری صورت میں موجود نہیں تھا، لہٰذا اس میں حذف و اضافہ بھی ہوا ہے۔

جیفری کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ اس نے ابن ابی داؤد کی کتاب ''کتاب المصاحف'' ۱۹۳۷ء میں ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ یہ کتاب ۶۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بعض مباحث سے وہ متاثر تھا، اس نے اس کے مقدمے میں فرسودہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔(۹)

آرتھر جیفری کی وفات ۱۹۵۹ء میں ہوئی۔

(۵) رچرڈ بیل (Richard Bell)

رچرڈ بیل ۱۸۷۶ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا، یہ برطانوی مستشرق تھا۔ رچرڈ بیل ''یونیورسٹی آف ایڈنبرا'' برطانیہ میں عربی زبان کا استاد رہا ہے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء کے دوران اس نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شائع کیا، جس کا نام "The Quran Translated with a crifical

"rearragnement of the surohs" ہے۔

۱۹۵۳ء میں اس نے اپنا مشہور مقدمہ قرآن مجید "Introduction of the Quran" شائع کیا۔
اس کی ایک اور مشہور کتاب "The Origin of Islam in its christion Environment" کے نام سے ہے، جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔

یہ تینوں کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہیں۔

رچرڈ بیل نے اپنے مقدمے کو دس فصلوں میں تقسیم کیا ہے، جن کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے:

۱- پہلی فصل جس میں اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کے احوال ونظریات کو بیان کیا ہے، اس کے تحت وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآنی اسلوب یہودیت، عیسائیت، حنیفیت اور زرتشتی مذہب سے متاثر ہے۔

۲- دوسری فصل نزول قرآن اور جمع قرآن کے متعلق ہے۔ اس میں اس نے قرآن مجید میں کمی بیشی کا دعویٰ کیا ہے۔ دلیل کے طور پر قرأت کے اختلاف کا حوالہ دیا ہے، اس کے تحت اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ صحابہ کرام کے مصاحف قرآنیہ کا اختلاف تھا جب کہ قراءت کا اختلاف دراصل لہجات کا تنوع تھا۔

۳- تیسری فصل میں قرآن مجید کے پاروں، احزاب، سورتوں میں تقسیم کے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ محض تلاوت کی غرض سے تھی۔

۴- چوتھی فصل اسلوب قرآن کے متعلق ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآنی اسلوب کاہنوں کے کلام سجع پر قائم ہے۔

۵- پانچویں فصل سورتوں کے اختصار وطول اور آیتوں کے تکرار اور نحوی اغلاط کے بارے میں ہے۔ بعض جگہوں پر وہ قرآن مجید کی کچھ عبارتوں میں اضافہ بھی کرتا ہے کیوں کہ وہ کہتا ہے کہ وہ عبارات ناقص ہیں اور یہ اضافے ان کی تکمیل کا باعث ہیں۔

۶- چھٹی فصل میں اس نے قرآن مجید کے ترتیب نزول پر بحث کی ہے۔

۷- ساتویں فصل قرآن مجید کی بعض مخصوص آیات کے معانی ومفاہیم کی توضیح پر مبنی ہے۔ جس میں اس نے بعض جگہوں پر قرآن مجید میں انجیل سے استفادہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۸- آٹھویں فصل میں اس نے قرآن مجید کے تصور توحید اور اسماء وصفات جیسے مضامین کے مصادر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

۹- نویں فصل میں اس نے قرآنی قصص پر گفتگو کی ہے، جس کو اس نے یہودیت، عیسائیت سے ماخوذ بتایا ہے۔

۱۰- دسویں فصل شریعت کے بعض احکام جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، سود، شراب اور جوا وغیرہ کے متعلق ہے۔(۱۰)

رچرڈ بیل کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔

ہمارا لائحۂ عمل

(۱) اس سلسلے میں ہمارا لائحۂ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کے اعتراضات کا جواب دیں۔ اب ان کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے ہمیں مطالعہ کی ضرورت پیش آئے گی تو ہمیں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم ان کے اعتراضات کا عمدہ اور صحیح جواب دے سکیں۔

(۲) جواب دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے مذاہب پر تنقید بھی کرنی چاہیے۔ اگر وہ ہمارے اسلام پر سیاہی کا ایک قطرہ چھڑک کر ہمارے اسلام کو داغ دار بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں ان کے مذاہب پر سیاہی کا پورا ڈبہ ہی چھڑک دینا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۳) بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں ان کے اعتراضات بظاہر صحیح معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ہم ان کے اعتراضات کی تحقیق کریں گے، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے اعتراضات غلط تھے اور ہم صحیح تھے۔

(۴) آج کے دور میں تحقیق سے آراستہ اور جدید اسلوب اور موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ہر زبان میں کتابیں لکھی جائیں، تاکہ نئی نسل کو مستشرقین کے گمراہ کن نظریات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

(۵) عہد حاضر کی اشد ضرورت ہے کہ پورے اشتراقی لٹریچر کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور اس کو مکمل اور باضابطہ طور پر علمی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور ان مسلمان مصنّفین کی تحریروں کو بھی جن

کے طرزِ فکر میں مستشرقین کے خیالات کا عکس جھلکتا ہے، ان کی تحریروں کا جائزہ لے کر علمی تلبیسات و تدلیسات کو واضح کیا جائے۔

(۶) یونیورسٹیوں اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کے سربراہ اور اساتذہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ ان کے طالب علم مستشرقین کے مراجع پر اعتبار نہ کریں۔

(۷) اس زہر قاتل کا تریاق مہیا کرنا، اس وقت علم دین اور دین اسلام کی بہت بڑی اور نہایت ضروری خدمت ہے۔

مراجع ومصادر

۱۔ اسلام اور مستشرقین، ڈاکٹر حافظ محمد زبیر، ص: ۲۳، طبع اول اکتوبر ۲۰۱۴ء

۲۔ حوالۂ سابق، ص ۲۵

۳۔ اسلام اور مستشرقین، ج ۲، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا مقالہ، پروفیسر اجناس گولڈزیہر، ص: ۳۹-۴۷

۴۔ الصّف: ۶

۵۔ قرآن مجید اور مستشرقین (غلط فہمیوں کا جائزہ) مولانا محمد جرجیس کریمی، ص: ۳۲

۶۔ حوالۂ سابق، ص: ۳۳

۷۔ السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر، الاتقان فی علوم القرآن، الھیئۃ المصریۃ العامۃ، جلد اول، ص ۲۰۲، ۱۹۷۴ء

۸۔ صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، ج ۶ ص: ۱۸۷

۹۔ قرآن اور مستشرقین، ڈاکٹر حافظ محمد زبیر، سہ ماہی حکمت قرآن، لاہور، جولائی-ستمبر ۲۰۱۳

۱۰۔ اسلام اور مستشرقین، ڈاکٹر حافظ محمد زبیر، ص: ۳۶-۳۸، طبع اول اکتوبر ۲۰۱۴ء

تفسیر اور علوم تفسیر پر مستشرقین کی تحقیقات

توثیق کلیم

(۱) تفسیر اور علوم تفسیر ایک مختصر تعارف

لفظ تفسیر کا مادہ ف، س، ر ہے، جس کا مفہوم واضح کرنا، کھول کر بیان کرنا، بے حجاب کرنا، اور ظاہر کر دینا ہے چنانچہ فسر المعطی کے معنی ہوئے ڈھکے ہوئے کو کھول دینا۔ اس طرح تفسیر کے معنی ہوئے کشف، وضاحت، شرح بیان اور تفسیر کی جمع تفاسیر آتی ہے۔(۱) امام زرکشی نے البرھان فی علوم القرآن میں تفسیر کی تعریف یوں کی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے، جس کی مدد سے قرآن کریم کے مطالب ومعانی معلوم کیے جاتے ہیں اور اس میں احکام ومسائل اور اسرار وحکم سے بحث کی جاتی ہے۔(۲)

تفسیر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) تفسیر مأثور (۲) تفسیر بالرأی

تفسیر مأثور وہ تفسیر ہے، جو حدیث کی روشنی میں لکھی گئی ہو۔ اسی میں اقوال صحابہؓ بھی شامل ہیں۔ تفسیر ماثور میں سب سے بہترین تفسیر علامہ طبریؒ کی تفسیر طبری مانی جاتی ہے۔

اسی طرح تفسیر بالرأی وہ تفسیر ہے، جو خود کی تخلیق وتاویل سے لکھی گئی ہو۔ مختلف اقوال کے مطابق تفسیر بالرأی پر سب سے عمدہ تفسیر علامہ رازی کی فتح الکبیر ہے، کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس تفسیر میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے۔ علامہ دراصل علم کلام کے ماہر تھے اس کا اثر ان کی تحریروں میں جابجا نظر آتا ہے۔

مختصر اور خاص تفاسیر کا ذکر

(۱) تفسیر الصحابہ دکتور عبداللہ ابوالسعو دبدر، دار ابن حزم، بیرون الطبعہ ۱۴۲۱

(۲) تفسیر الصحابہ دکتور محمد عبدالرحیم ممیّزاتہ، خصائصہ، مصادرہ، قیمۃ العلمیۃ القاہرہ

(۳) تفسیر ابن مسعودؓ محمود محمد احمد عیسیٰ موسسۃ الملک فیصل م الخیریۃ الریاض۔

(۴) تفسیر مرویات ام المومنین عائشہؓ فی التفسیر ڈاکٹر سعود السفیان، م التوبہ ریاض

(۵) تنویر التباس من تفسیر ابن عباس، قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی پاکستان

علوم تفسیر

علوم تفسیر ایک نہایت ہی جامع عنوان ہے، اس معنوں میں کہ اس میں تدوین قرآن، اعجاز القرآن، نسخ القرآن جیسے تمام عناوین شامل ہیں۔ اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن تدوین قرآن پر مستشرقین نے بہت سارے اعتراض کیے ہیں، اسی طرح علوم القرآن میں مکی و مدنی سورتوں اور حروف مقطعات پر بھی بحث آئے گی، جس کے دامنوں کو انھوں نے نقص العقل سے تاویل کر کے گندے کر دیے ہیں۔

حروف مقطعات

مقطع قطع سے بنا ہے، جس کے معنی کسی چیز کے اجزا کو کاٹ دینے کے ہوتے ہیں۔ اسی سے مفعول ہے، مقطع یعنی جس کو اچھی طرح کاٹ دیا گیا ہو۔

اصطلاح میں حروف مقطعات وہ ہجائی حروف ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے بعض سورتوں کا آغاز فرمایا ہے۔ وہ ایک یا ایک سے زائد حروف ہیں اور ان میں سے ہر حرف کو جدا جدا پڑھا جاتا ہے۔ (۳)

اہل علم کے اقوال

اہل علم نے بنیادی طور پر حروف مقطعات سے متعلق دو راستے اختیار کیے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ انہیں متشابہات یا امور غیبیہ میں مانا جائے۔

(۲) دوسرا یہ کہ ان کے معنی و مراد کو انسانی ذہن کے ادراک و دسترس میں رکھا جائے۔

اس دوسرے نکتہ کو اختیار کرنے والے علماء نے حروف مقطعات کے معانی بیان کیے ہیں۔ امام زرکشیؒ نے بیس (۲۰) سے زیادہ آراء پیش کی ہیں، جن میں سے کچھ تو قابل فہم اور معقول ہیں جب کہ کچھ وہ ہیں جو بے سرو پا اور غیر متعلق ہے۔ (۴)

علماء کی اکثریت کا اتفاق متشابہات پر ہے۔جن علماء نے ان حروف کو متشابہات کہا ہے ان میں سے یہ مشہور ہیں:

(۱)علامہ زرقانیؒ (مناھل العرفان فی علوم القرآن)(۲) آلوسیؒ (روح المعانی، جلد اول، ص۱۰۰)(۳) قرطبیؒ (تفسیر قرطبی جلد اول)(۴)ابو حیانؒ (البحر المحیط فی التفسیر، جلد اول ص۶۰)(۵) سیوطیؒ (الاتقان فی علوم القرآن، جلد دوم، ص۳۹۹)(۶)ابن قتیبہؒ (تاویل مشکل القرآن ص۱۰۲)(۷)ابو یحییٰ زکریاؒ (فتح الرحمٰن بکشف مایلتبس فی القرآن ص۱۹)(۸)ابن کثیرؒ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، ص۳۶)(۹)ابو طاہر مکیؒ (العمدۃ فی غریب القرآن، ص۶۹)(۱۰)اشرف علی تھانویؒ (ترجمہ وتفسیر تھانوی، ص۳، سورہ۳)(۱۱)مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (تفہیم القرآن، جلد اول، ص۴، سورہ۱)(۱۲)احمد رضا خان بریلویؒ (کنز الایمان، ص۴، سورہ۱)(۱۳)عبد الماجد دریا بادیؒ (تفسیر ماجدی)(۱۴)امین احسن اصلاحیؒ (تدبر قرآن، البقرہ)

لیکن اسی مسلک پر امام شوکانی علیہ الرحمہ نے اپنا موقف ظاہر کر کے اس کی تائید میں بڑی سخت گیری کا ثبوت دیا اور حروف مقطعات کی تشریح وتاویل کے بارے میں کچھ بھی کہنے والوں کے خلاف ایک معنی میں جنگی محاذ کھول ڈالا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ان حروف مقطعات کے معنی جو شخص بھی یہ کہہ کر بیان کرے کہ یہی ان سے اللہ کی مراد ہے تو اس نے انتہائی غلط بات کہی اور اپنے فہم اور دعوے کو ثابت کرنے کے چکر میں بڑی زیادتی کر بیٹھا۔

متشابہات کو سمجھنے کی جستجو کرنے اور ان کی حقیقی مراد پانے کی کوشش سے شریعت نے ہمیں منع کیا ہے، حالاں کہ متشابہ آیات بھی عربی الفاظ میں ہوتی ہیں اور معلوم ومعروف ترکیبوں میں ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ بھی متشابہات کی کنہ جاننے کے چکر میں پڑتے ہیں ان کے بارے میں فیصلہ خداوندی ہے کہ ان کے دلوں میں زیغ وضلال داخل ہے، یہ متشابہ آیات کے بارے میں ہے جب کہ حروف مقطعات کا معاملہ ان سے بھی زیادہ عارض اور مبہم ہے ان کے بارے میں کہنا چاہیے کہ ان کا تشابہ دوگنا ہے، یہ تب ہے جب کہ ہم فرض کر لیں کہ فہم انسانی کی راستے سے ان کی حقیقت پا سکتا ہے اور یہ زبان دانی کا ان میں کچھ نہ کچھ عمل داخل ہے، مگر بظاہر ہم دیکھتے ہیں کہ حروفِ مقطعات ہمارے ہر لسانی وبلوغی انداز سے خارج ہے، ایسے میں ان کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔(۵)

حروف مقطعات پر مستشرقین کی تحقیقات

بعض مستشرقین کی رائے میں حروف مقطعات ان صحابہ کرامؓ کے اسماء کا مخفف ہیں جن کے نسخوں کی مدد سے قرآن حکیم کی تدوین کی گئی ہے، اس رائے کا سب سے پہلے اظہار مشہور مستشرق Thedor Nodeke نے اپنی کتاب "The History of the Holy Quran" میں کیا ہے، انھوں نے اس کتاب مکیں اس نظریے کا اظہار کیا ہے کہ حروف مقطعات قرآن کے متن کا حصہ نہیں ہے بلکہ ان مسلمانوں کے ناموں کا مخفف ہے جنھوں نے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی مین اپنے لیے قرآنی سورتوں پر مشتمل نسخے تیار کیے تھے اور جب حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کی جمع و تدوین کی تو انھوں نے قرآن کے خطی نسخوں کے مالکان کے ناموں کو بطور علامت باقی رکھا مثلاً ''الرٰ'' میں (ز) کے بجائے (ر) کا استعمال کیا گیا ہے، اور یہ ''زبیر'' کا مخفف ہے۔اسی طرح (''المر'') مغیرہؓ کے طرف اشارہ کرتا ہے اور ''حم'' عبدالرحمٰن کا مخفف ہے۔

نولڈیکے کا یہ بھی کہنا ہے کہ بعد میں آنے والے مسلمان ان علامتوں کے معنی نہیں جانتے تھے اور اتفاقیہ طور پر متن قرآن میں باقی رہ گئے ہیں۔اس مفروضے کی بنا پر یہ فقط کسی نسخے کی ملکیت ظاہر کرنے کے لیے سادہ سی علامتیں ہیں۔غور وخوض نہ کرنے کی وجہ سے متن قرآن میں لکھے جاتے رہے اور لکھے جارہے ہیں۔اسی رائے کو لے کر کافی مستشرقین نے اپنے نظریہ کے مطابق حد درجہ تاویل وتخفیف وتحقیر کرنے کی کوشش کی۔

تحقیقات غلط کا مدلل جواب

(۱) یہ نظریہ ایک باطل بنیاد پر استوار ہے کیوں کہ اس کے مطابق یہ حروف اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے، بلکہ نص قرآنی پر اضافہ ہے اس طرح یہ نظریہ مسلمانوں کے اس اجماع کے خلاف ہے، جس کے مطابق موجودہ قرآن میں کوئی کمی یا بیشی واقع نہیں ہوا ہے۔

(۲) روایات میں بھی آیا ہے اور تاریخ میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے ان حروف کی تلاوت کی ہے اور کیا کرتے تھے۔

(۳) جن افراد کا وہ تذکرہ کرتے ہیں ان میں سے تمام کاتبان وحی تھے اور نہ ہر ایک کے پاس کوئی

الگ الگ اپنا نسخہ موجود تھا۔

(۴) اگر یہ حروف مختلف نسخوں کے مالکوں کے ناموں کا مخفف ہیں تو پھر انہیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد نہیں اس سے پہلے آنا چاہیے۔

اس موضوع پر ڈاکٹر سید کاظم طباطبائی نے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جس کا عنوان ''حروف مقطعات از منظر قرآن شناسان عربی ہے۔'' (۶)

مکی و مدنی سورتوں کا تعارف

علم مکی و مدنی سے مراد قرآن کریم کی آیات و سورتوں کے نزول کا علم ہے۔ جس کا علم بظاہر مقامات نزول سے ہوتا ہے مگر در حقیقت زمانہ نزول ہی اس کا صحیح مصدر ہے نہ کہ مقام۔ واضح رہے کہ قرآن کریم تقریباً تیئیس سال تک نازل ہوتا رہا۔ یہ زمانہ تنزیل دو حصوں پر منقسم ہے: (۱) مکی سورتیں (۲) مدنی سورتیں۔

اکثر مفسرین کے مطابق ''مکی آیات'' کا مطلب وہ ہے جو آپؐ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی۔ بعض لوگ مکی کا معنی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن اکثر مفسرین کے مطابق یہ مطلب سمجھنا درست نہیں اس لیے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں، جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئی لیکن چوں کہ ہجرت سے قبل نازل ہوئیں اس لیے مکی ہے اور انہیں مکی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ منیٰ، عرفات وغیرہ اور سفر معراج کے دوران نازل ہونے والی آیات ایسی ہی ہیں، یہاں تک کہ سفر ہجرت کے دوران کے جو آیات راستے میں نازل ہوئیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں۔

اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں مگر انہیں مدنی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ہجرت کے بعد آپ ﷺ کو بہت سے سفر پیش آئے، جس میں آپؐ دور دور تک تشریف لے گئے ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیات مدنی کہلاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان آیتوں کو مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں۔

چنانچہ **ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا** مدنی ہے حالاں کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی۔ (۷)

اہل علم کے نزدیک مکی و مدنی کی پہچان کرنے کے دو طریقے ہیں: (۱) سماعی: آیت یا سورت کے

مکی و مدنی ہونے کے بارے میں صحیح روایت سے معلوم ہونا سماعی طریقہ کہلاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ قابل اعتماد ہے۔ کیوں کہ صحابہ کرامؓ ہر آیت کا مقام نزول اور زمانہ نزول جانتے تھے۔ عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ''واللہ'' جس کے سوا کوئی الہٰ نہیں قرآن پاک کی جو بھی آیت نازل ہوئی میں اس کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں نازل ہوئی اور کس چیز کے بارے میں نازل ہوئی۔

(۲) قیاسی: آیت یا سورت کے مکی و مدنی کی پہچان کرنے کے لیے عقل سے کام لینا قیاسی طریقہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ سماعی طریقہ زیادہ قابل ترجیح ہے مگر قیاس کو بھی مطلقاً رد نہیں کیا جا سکتا اور مکی و مدنی کی تعیین میں سورتوں کی علامات کو دیکھتے ہوئے عقل سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرۃ میں ہم روزہ، حج، قصاص، نکاح، طلاق وغیرہ کے احکام پائے جاتے ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئے۔ سورہ صافات میں دلائل کو ہم مکالمہ کے انداز میں پاتے ہیں جو مشرکین کے ساتھ اپنایا گیا ہے اور جو مکی ہونے کا اشارہ دیتی ہے۔(۸)

مکی سورتوں کی مختصر خصوصیات

(۱) ان میں سورتیں مختصر اور مدلل ہوتی ہیں۔

(۲) ان کے اسلوب میں ایک قوت ہے اور خطابت میں شدت بیان زیادہ خوب صورت ہے۔

(۳) ان میں بت پرستوں اور متکبر و مغرور عناصر سے مقابلہ و مکابرہ ہے۔

(۴) ان میں عقائد وایمانیات کی دعوت ہے اور انہی پر زیادہ توجہ دی گئی ہے ساتھ ہی اخلاق عالیہ اور نیکی پر قائم رہنے کی دعوت بھی ہے۔

(۵) مسلمانوں کو صبر اور نرمی کا حکم ہے۔

مدنی سورتوں کی مختصر خصوصیات

(۱) ان میں سورتیں طویل اور مفصل ہوتی ہیں اور ان کے انداز بیان میں نرمی کی جھلک زیادہ نمایاں ہے۔

(۲) ان میں اہل کتاب اور منافقین کے ساتھ جدال و نزاع اور حکم جہاد ہے۔

(۳) ان میں دینی حقائق اور دلائل و براہین بیان کیے گئے ہیں۔

(۴)ان میں انداز نسبتاً سادہ ہے۔

(۵)ان میں عبادات و معاملات کے احکام غالب ہیں۔

پورے قرآن میں متفقہ مکی سورتیں ۸۲ اور مدنی سورتیں ۲۰ ہیں اور مختلف فیہا ۱۲ ہیں۔

مکی و مدنی سورتوں پر مستشرقین کی تحقیقات

مستشرقین نے مکی و مدنی سورتوں اور آیتوں میں اختلاف کر کے اسے Vital Issu قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں سے کچھ آیات نکال دی گئیں ہیں اور کچھ اضافہ کر دی گئی ہیں مثلاً: قراء کوفہ کے ہاں قرآن کی کل آیات ۶۲۷۳ ہیں۔ مدنی علماء کے ہاں ۶۲۱۴ ہیں اور باقی دنیا کے مسلمانوں کے ہاں ۶۶۶۶ ہیں۔اسی کے ساتھ مستشرقین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مکی سورتوں کا اسلوب بیان شاعرانہ ہے۔مکی سورتوں کو اس نے مزید تین ادوار یعنی ابتدائی، وسطی اور آخری دور میں تقسیم کیا ہے۔ اس نے قرآنی سورتوں کو اسلوب کلام کے پہلو سے چار اجزا میں تقسیم کر دیا ہے۔

مستشرقین بعض اعتراضات

۱۔قرآن مجید محمد ﷺ کی تصنیف ہے۔[نعوذ باللہ]

۲۔ قرآن مجید انجیل کی نقل ہے۔

۳۔قرآن مجید ادب کی کتاب ہے۔

سب سے بڑا اور اہم اعتراض جو انھوں نے کیا ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کو آپ ؐ کا تصنیف کردہ کلام ہے۔اس غلط فہمی اور نا سمجھی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس مقدس کلام کو سمجھنے کے لیے جاہلی اشعار یا شاعری، عرب حنفا، توریت و انجیل کو مصادر قرار دیا جب کہ یہ چیزیں بالکل بھی قابل اعتماد نہیں ہے، الا یہ کہ اشعار مگر اقل ان کا فہم قرآن کا راستہ چونکہ قرآنی ذوق، فصاحت و بلاغت، اسلوب قرآنی مع خاص مصدر (فہم حدیث) اور اس کے علاوہ بھی درجن بھر علوم ہیں جن کا جاننا نہایت ہی ضروری ہے کے علاوہ رہا اس لیے گمراہی کا وہ شکار ہوئے (علوم القرآن، صبحی صالح) چوں کہ یہ اعتراض عقیدہ قرآن پر بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کے رد میں قرآن خود چیلنج کرتا ہے۔ **''فأتو بسور مثله مفتريات و ادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صادقين ۔(۹)**

تنبیہ

یہ دشمنانِ اسلام ہیں۔ان کی ہر لمحہ کوشش اسلام کو مغلوب اور مسیحیت کو غالب کرنے کی ہوتی رہی ہے، بذریعہ اسلام کے چھوٹے اور بڑے مسائل پر اعتراضات اور الزامات کیے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس دشمن تحریک کو طاقت ور سمجھ کر ناامید ہو جائیں۔

ضرورت ہے کہ ان کے اعتراضات کا مدلل و مفصل اور عقلی و نقلی دلیل دے کر هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ کے علمبرداروں میں شامل ہو جائیں اور دشمنوں سے باخبر رہ کر چوکنا رہنا ہے اور اللہ و رسول کو اسوہ مان کر اپنے آپ کو جنت کا حق دار ہونا ثابت کریں۔

مراجع ومصادر

۱۔ مصباح اللغات عبدالحفیظ بلیاوی، ص۶۲۱
۲۔ تاریخ تفسیر و مفسرین، غلام احمد حریری، ص۳۱
۳۔ البرہان فی علوم القرآن للزرکشی
۴۔ حوالۂ سابق
۵۔ فتح القدیر، جلد اول، ص۴۸، ۴۹
۶۔ مزید تفصیل کے لیے رجوع کر سکتے ہیں، نور معرفت سہ ماہی مجلّہ، پاکستان۔
۷۔ مناہل العرفان فی علوم القرآن، جلد اول، ص۱۸۸۔
۸۔ قرآنی معلومات، ابوعدنان محمد طیب Google۔
۹۔ اسلام اور مستشرقین، ڈاکٹر حافظ زبیر (PDF)

مستشرقین جو بعد میں مسلمان ہو گئے

عاطف سہیل

مستشرقین میں ایسے بے شمار لوگ بھی ہیں جنھیں توفیق خداوندی نے حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ہم ذیل میں ایسے چند خوش نصیب لوگوں کا ذکر کرتے ہیں،جن کو ان کی تحقیق اور توفیق خداوندی نے منزل مراد تک پہنچایا اور انھوں نے کلمۂ توحید پڑھ کر دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کی۔

ا-عبداللہ بن عبداللہ

ان کے قبول اسلام کا حال پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب ''دعوت اسلام'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔پروفیسر آرنلڈ نے عبداللہ بن عبداللہ کا پرانا عیسائی نام ذکر نہیں کیا کیوں کہ پروفیسر موصوف نے ان کے حالات ان کی خودنوشت سے نقل کیے ہیں،جس میں ان کا صرف اسلامی نام مذکور ہے۔ عبداللہ بن عبداللہ ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت اس انداز میں ہوئی کہ بڑے ہو کر عیسائی پادری بن سکیں۔مختلف یونیورسٹیوں سے دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک عمر رسیدہ پادری کی خدمت میں گزارا۔اس پادری کو عالم عیسائیت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور لوگ اس کے بڑے قدر دان تھے۔پادری کو اپنے اس شاگرد پر بڑا بھروسہ تھا اور اس نے اپنے مال ومتاع کی کنجیاں اس کے حوالے کر رکھی تھیں۔

ایک دن پادری اپنی درس گاہ نہ جاسکا۔اس کی عدم موجودگی میں اس کے شاگرد دیر تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول پر بحث کرتے رہے کہ ''میرے بعد ایک نبی آئے گا،جس کا نام فارقلیط ہوگا۔'' وہ یہ بحث کرتے رہے کہ اس کلام میں فارقلیط سے کون مراد ہے؟ لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔عبداللہ نے واپس جا کر پادری کے سامنے اس بحث کا ذکر کیا اور اپنے استاد سے درخواست کی کہ جس طرح انھوں نے

اپنے علم کے بے بہا موتی عطا فرمائے ہیں اسی طرح اس عقیدے کو بھی حل کر دیں۔ پادری نے رونا شروع کر دیا اور کہا: میرے بیٹے! بے شک تم مجھے بہت عزیز ہو کیوں کہ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ فی الواقع اس مبارک نام کے معنی دریافت کرنے میں بڑا فائدہ ہے، مگر مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے اس کا نام تم پر ظاہر کر دیا تو عیسائی تجھے فوراً مار ڈالیں گے۔ عبداللہ نے راز افشانہ کرنے کا وعدہ کیا تو پادری نے کہا: میرے فرزند! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ فارقلیط پیغمبر اسلام محمد (ﷺ) کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام ہے۔ اور یہ وہی پیغمبر ہیں جن پر وہ چوتھی کتاب نازل ہوئی، جس کا اعلان دانیال کی زبان سے ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام کا دین یقیناً سچا دین ہے اور ان کا مذہب وہی شان دار اور پورا مذہب ہے جس کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔ پادری نے عبداللہ کو دین اسلام قبول کر لینے کی نصیحت کی لیکن خود عبداللہ کی منت سماجت کے باوجود اس نعمت کو اپنے دامن میں سجانے سے محروم رہا۔

عبداللہ استاد سے رخصت ہوا، مختلف ممالک سے ہوتا ہوا تیونس جا پہنچا۔ وہاں کے عیسائیوں نے آپ کی شہرت کی وجہ سے بہت خاطر مدارات کی، وہ چار مہینے عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کی گئی۔ آخر وہ تیونس کے سلطان ابوالعباس احمد کے پاس پہنچے اور اسلام مقبول کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ سلطان نے انھیں خوش آمدید کہا۔ عبداللہ نے درخواست کی کہ ان کے اسلام قبول کرنے کے اعلان سے پہلے عیسائیوں کی ان کے متلق رائے معلوم کر لیں۔ کیوں کہ جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے اس پر اس کے ہم مذہب ہر قسم کی الزام تراشیاں کرتے ہیں۔ سلطان نے کہا ''تم نے بالکل وہی بات کہی ہے، جس طرح عبداللہ بن السلام نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کہی تھی'۔

سلطان نے عبداللہ کی درخواست کے مطابق عیسائیوں کو شاہی دربار میں جمع کیا اور ان سے عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ جب سلطان عیسائیوں سے یہ سوال جواب کر رہے تھے عبداللہ برابر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عیسائیوں نے جواب دیا: وہ ہمارے بہت بڑے عالم ہیں۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ انھوں نے علم و فضل اور پرہیزگاری میں عبداللہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ سلطان نے عیسائیوں سے پوچھا کہ اگر تمہارا یہ پادری مسلمان ہو جائے تو تم اس کی نسبت کیا خیال کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا، ''معاذ اللہ! وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔'' سلطان نے عبداللہ کو اپنے پاس بلایا۔ عبداللہ دوسرے کمرے سے اٹھ کر سلطان کے پاس آئے اور کلمۂ شہادت پڑھ کر حلقۂ اسلام میں شامل ہو گئے۔ عیسائیوں نے عبد

اللہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا کہ اس شخص نے صرف شادی کے شوق میں یہ حرکت کی ہے کیوں کہ پادری کی حیثیت میں وہ شادی نہیں کر سکتا تھا۔عبداللہ نے مسلمان ہونے کے بعد ۱۴۲۰ء میں عیسائیوں کے رد میں ایک کتاب لکھی جس کا نام **ھدیۃ الاریب فی الرد علی اھل الصلیب** رکھا۔پروفیسر آرنلڈ نے عبداللہ کے حالات زندگی اسی کتاب کے مقدمے سے نقل کیے ہیں۔

۲-رسل ویب(Russel Webb)

ان کا پورا نام محمد الیگزینڈر رسل ویب ہے۔ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ادیب،مصنف اور صحافی تھے۔(سینٹ جوزف گزٹ اور ''میسوری ریپبلکن'' کے ایڈیٹر رہے) ۱۸۸۷ء میں فلپائن میں ریاست متحدہ امریکہ کے قونصلر مقرر ہوئے۔رسل ویب فرماتے ہیں:

> ''میں گہرے اور وسیع مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسلام وہ واحد اور بہترین نظام حیات ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔بعض نوجوانوں کے برعکس میں ابتدا سے مذہب کے ساتھ اچھا لگاؤ رکھتا تھا۔مگر بیس سال کی عمر میں جوں ہی شعور مند ہوا، چرچ کی خشک اور بے معنی رسومات و قیود سے سخت بیزار ہو گیا۔عیسائیت سے بے زار ہو کر میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا جو مجھے مطمئن نہ کر سکا۔آخر اسلام کو پڑھنے کا موقع ملا تو حق واضح ہو کر سامنے آ گیا۔یاد رہے! میں نے اسلام کو کسی جذباتی ردعمل،اندھی عقیدت یا محض سطحی جوش سے متاثر ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل مخلصانہ، دیانت دارانہ اور قطعی غیر متعصّبانہ مطالعہ اور تحقیق کارفرما ہے۔''

۳-جان سنت

انگریز مبشر ''جان سنت'' نے اسلام قبول کر کے اپنا نام ''محمد جان'' رکھا۔ان کا تعلق برطانیہ کی ''سالوویشن آرمی'' کے ساتھ تھا،جس کا مشن عیسائیت کی تبلیغ ہے۔وہ کہتے ہیں:''میرے دل میں عیسائیت کے متعلق شکوک پیدا ہوئے تو میں اشتراکیت کی طرف مائل ہوا۔لیکن اس نظام میں میری روح کے لیے کچھ نہ تھا۔پھر بدھ مت اور دیگر ادیان کے مطالعہ کے بعد ۱۹۵۰ء میں حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا تفصیلی مطالعہ کیا۔اسلام کے مطالعے سے مجھے اپنی زندگی کے تمام مسائل کا حل پوری وضاحت کے ساتھ مل گیا۔پھر برطانیہ میں ''برٹش مسلم ایسوسی ایشن'' قائم کیا۔میرے کثیر ہم وطن

انگریزوں نے اسلام کی تعلیمات کو سمجھ لینے کے بعد اسلام قبول کیا۔

۴-ڈاکٹر مارٹن لنگز (Dr. martin Lings)

مشہور برطانوی مستشرق ڈاکٹر مارٹن لنگز مصر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور پھر 'برٹش میوزیم لائبریری' کے سربراہ رہے۔ انھوں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اسلامی تصوف کو خصوصی توجہ دی۔ بقول زکریا ہاشم زکریا 'وہ تصوف کی سیڑھی کے ذریعے خدا تک جا پہنچے'۔

۵-ڈاکٹر ارتھر کین

اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام علی عمر کریم رکھا۔ شروع میں مختلف ادیان کا مطالعہ شروع کیا، کہتے ہیں: 'بیس سال کے مطالعہ سے مجھے عقلی اور روحانی طور پر یقین ہو گیا کہ اسلام سچا دین ہے۔ میں نیویارک کی مسجد میں پہنچا، میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر کا انسان مجھے نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کی اور میرے رب نے میرے دل کو ہدایت کے نور سے بھر دیا۔ قرآن کریم کے بارے میں فرماتے ہیں 'یہ ایک مقدس ربانی کتاب ہے، جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی'۔

۶-علامہ محمد اسد

۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ پہلا نام 'لیوپولڈ ویس' تھا۔ بائیس سال کی عمر میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ جرمنی کے ایک اخبار 'فرانکفرٹر' نے ان کو مشرق وسطی کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کیا۔ قبول اسلام کے بعد تقریباً چھ برس تک مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں مقیم رہے۔ پھر برصغیر آ گئے۔ سالہا سال شاعر مشرق علامہ اقبال کے قریب رہنے کا شرف حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد انھیں حکومت کی زیر سرپرستی ایک جدید محکمہ 'اسلامی تعمیر جدید' کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا۔ بعد میں ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئی اور ان کا تقرر وزارت خارجہ مشرق وسطیٰ کے افسر کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب بھی رہے۔ ان کا قیام پاکستان، سعودیہ عربیہ کے علاوہ مراکش میں بھی رہا۔ انھوں نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دی۔ ان کی دو کتابیں 'اسلام آن کراس روڈز' اور 'اے روڈ ٹو مکہ' بہت مشہور ہیں۔

۷-لارڈ ہیڈ لے الفاروق (Lord headiey Al-Farooq)

۱۹۱۸ء میں مسلمان ہوئے۔ ان کا پہلا نام ''وائٹ آنریبل سر رولینڈ جارج ایلین سن'' تھا۔ انگلستان کے امراء میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ سیاست داں بھی تھے اور مصنف بھی۔ ان کی کتابوں میں Western Awakening to Islam بہت مشہور ہے۔ وہ اپنے قبولِ اسلام کے متعلق لکھتے ہیں: ''ممکن ہے میرے کچھ دوست سمجھیں کہ میں نے مسلمانوں سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا ہے۔ لیکن میرے اسلام قبول کرنے کا یہ سبب نہیں۔ میرا اسلام تو مسلسل کئی سالوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔'' اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام شیخ رحمت اللہ الفارق رکھا۔

۸-علاء الدین شلمی

ایک جرمن مفکر تھے۔ اسلام قبول کرنے کے متعلق فرماتے ہیں: ''میں نے مغرب کی گمراہی کو محسوس کیا کہ الحادیت اور سرمایہ داری مادی نظاموں میں سرگرداں ہیں۔ وہ لوگ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ اس تاریک ماحول میں، میں نے محسوس کیا کہ اسلام تمام ادیان کا نچوڑ ہے۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک روز میری نظر قرآن پڑھتے ہوئے اس آیت کریمہ پر پڑی: فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ۔ ''دوڑ واللہ تعالیٰ کی طرف۔''

میں نے سوچا میں کہاں جاؤں؟ آخر قاہرہ (مصر) جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مجلس میں پہنچا جہاں اکناف عالم سے آئے ہوئے مسلمان رنگ ونسل کی تمیز کے بغیر ذکر ''اللہ'' میں مصروف تھے۔ میں بھی اس مجلس میں شامل ہوا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا جب میرا ہاتھ ایک سیاہ فام مسلمان بھائی کے ہاتھ میں تھا۔ اور ہم ''اللہ احد'' پڑھ رہے تھے۔ سچ ہے اسلام وہ دین ہے جو کبھی مغلوب نہ ہوگا۔

۹-ڈاکٹر عمر رولف ایرنفلس (Dr. Umar Rolf Ehrenfels)

ان کا تعلق آسٹریا سے تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے ان کو ترکوں اور عربوں کے حالات جاننے کی طرف مائل کر دیا۔ پھر اپنے والد اور ان کے دوست کی نگرانی میں مشرقی مذاہب اور مشرقی زبانوں کی تعلیم میں باقاعدہ مشغول ہوگئے۔ پھر اپنے ایک دوست کے ساتھ ترکی کا سفر کیا۔ ترکوں کے برتاؤ نے ان کو بہت متاثر کیا۔ ترکی سے واپس اپنے وطن آکر انھوں نے ترکی کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو برلن کے

رسالے ''مسلم ریویو' میں قسط وار چھپی۔ اسی رسالے کی وساطت سے ان کی ملاقات سیالکوٹ کے ایس این عبداللہ سے ہوئی، جن کے ساتھ انھوں نے برصغیر کا سفر کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''یہ سفر میری زندگی کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا اور میں نے بالآخر وہ فیصلہ کر ہی لیا، جس کی طرف قدرت ایک مدت سے میری رہ نمائی کر رہی تھی۔ اسلام کی مندرجہ ذیل باتوں نے مجھے خصوصی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا:

۱-اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام ایک ہی پیغام لے کر آتے رہے، روشنی کا منبع ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور ہر نبی نے نسل انسانی کے سامنے جو پروگرام پیش کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔

۲-حضورﷺ کے بے مثال کارناموں کے باوجود آپ کو مافوق الفطرت حیثیت نہیں دی جاتی ہے۔

۳-اسلام انسانی اخوت کا علم بردار ہے، اور نسلی یا لسانی تفریق کا قائل نہیں۔

۴-اسلام پوری انسانیت کے لے سراپا رحمت ہے۔

اور بھی بہت سے مستشرقین نے اسلام قبول کیا، جن میں داکٹر غرینیہ (فرانس)، ڈاکٹر خالد شیلڈرک، محترمہ جمیلہ (امریکہ)، داکٹر عبداللہ علاء الدین (جرمنی)، الفونس اتیین (فرانس)، ڈاکٹر تھرکین (امریکہ) ڈبلیو ایچ کیولیم (W.H. Quilliam) وغیرہ شامل ہیں۔ اسلام کی دہلیز پر جبین فرمائی کرنے والوں میں صرف اہل مغرب ہی نہیں بلکہ اہل مشرق میں ہندومت، بدھ مت، سکھ مذہب کے پیروکاروں نے بھی مسلسل مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مستشرقین صدیوں سے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے میں کوشاں ہیں۔ لیکن ان کی مساعی کے باوجود ان کے اپنے مذاہب اور ان کی اقوام کے لوگ مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔

مراجع ومصادر

۱۔ قرآن حکیم اور مستشرقین، ثناء اللہ حسین

۲۔ استشراق اور مستشرقین کا تعارف، محمد حسن صانعی

۳۔ اسلام اور مستشرقین، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

سیرت نبوی ﷺ اور مستشرقین

صفی الرحمٰن نبیل

سنت نبویہ مطہرہ جو ایک تجدید پذیر عطیہ اور تا قیامت باقی رہنے والا توشہ ہے اور جس کو بیان کرنے اور جس کے مختلف عنوانات پر کتابیں اور صحیفے لکھنے کے لیے لوگوں میں نبی ﷺ کی بعثت کے وقت سے مقابلہ اور تنافس جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

یہ سنت مطہرہ مسلمانوں کے سامنے وہ عملی نمونہ اور واقعاتی پروگرام رکھتی ہے جس کے سانچے میں ڈھل کر مسلمانوں کی رفتار و گفتار اور کردار و اطوار کو نکلنا چاہیے اور اپنے پروردگار سے اس کا تعلق اور اپنے کنبہ و قبیلہ، برادران و اخوان اور افراد امت سے ان کا ربط اس کے عین مطابق ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً (الاحزاب:۲۱)

''یقیناً ہر اس شخص کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں بہترین اسوہ ہے جو اللہ اور آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہو۔''

لہٰذا جو شخص اپنی دنیا اور آخرت کے جملہ معاملات میں ربانی شاہراہ پر چل کر اس دنیا سے نجات چاہتا ہے اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ رسول اعظمؐ کے اسوہ کی پیروی کرے اور خوب اچھی طرح سمجھ بوجھ کر اس یقین کے ساتھ نبی ﷺ کی سیرت کو اپنائے کہ وہی پروردگار کا سیدھا راستہ ہے جس پر ہمارے آقا اور پیشوا رسول اللہؐ عملاً اور واقعتاً تمام شعبہ ہائے زندگی میں گام زن تھے۔

لہٰذا اسی میں قائدین و متبعین، حکام و محکومین، رہبران مرشدین اور مجاہدین کی رشد و ہدایت ہے اور

اسی میں سیاست وحکومت، دولت واقتصاد، معاشرتی معاملات، انسانی تعلقات، اخلاق فاضلہ اور بین الاقوامی روابط کے جملہ میدانوں کے لیے اسوہ ونمونہ ہے۔

سیرت کی مشہور کتاب

محمد بن اسحاق (ت ۱۵۱ھ یا ۱۵۲ھ) فن مغازی میں تاریخ وسیرت نگاری کے منتہائے کمال پر فائز ہے، امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں اوران کی کتاب المغازی متاخرین کے لیے مشعل راہ ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کا ان کے متعلق قول ہے: من اراد ان یتجد فی لمغازی فھو عیال علی ابن اسحاق۔ یعنی جوکوئی مغازی میں کمال وگہرائی کا طالب ہوتو وہ ابن اسحاق کی عیال ہے۔

ابن اسحاق کے کئی شاگردوں نے اس کتاب کی روایت کی ہے، جس میں زیاد بن عبداللہ بکائی کوفی کی روایت کوسب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کو ابن ہشام نے زیادہ اضافہ کرکے مرتب کیا۔

اس کتاب کا نفس مضمون تین قسم کی روایت پر مشتمل ہے:

(۱) ابتدائی حالات یعنی قبل از بعثت کے احوال

(۲) بعثت

(۳) مغازی یعنی سیرت ابن اسحاق کا اصل اور حقیقی ڈھانچہ۔

خصوصیات

سیرت سے متعلق قرآنی آیات کوتاریخی واقعات سے مربوط کرنے کا وہ خاص اہتمام فرماتے تھے۔ سابقہ سیرت نگاروں کی انجمن میں ابن اسحاق اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انھوں نے اس کے لیے اپنی کتاب میں مستقبل ابواب قائم کیے۔ مثلاً نزول سورۃ الانفال، اور ما نیزل فی المعذرین۔

ابن اسحاق کی یہ بھی خواہش تھی کہ فقہی اور تشریعی پہلوؤں کونمایاں کریں اور سیرت مغازی سے ان کومربوط کریں، روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ عہد نبوی کے حتی المقدور دستیاب دستاویزات، مکاتب، اور تحریری معاہدوں کی کاپیاں جمع کریں اوران سے استفادہ کریں۔ مسلمانوں اور یہود مدینہ کے درمیان مصالحت کا مکتوب جوکہ ابن اسحاق نے مکمل صورت میں نقل کیا ہے، اس کی کھلی شہادت پیش کرتا ہے۔

ابن اسحاق نے دوبارہ زیاد بن عبداللہ بکائی کوفی کو اپنی کتاب المغازی کا املا کرایا۔ سیرت ابن ہشام کا دار و مدار زیاد بن عبداللہ بکائی کے سماع پر ہے۔ یعنی ابن ہشام نے بکائی سے ابن اسحاق کی کتاب المغازی کا سماع کیا اور پھر حسب منشا اس کی تصحیح وتہذیب کی۔

ابن ہشام نے اولاً سیرت ابن اسحاق کو حضرت آدم علیہ السلام سے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کے سلسلۂ انبیا کی تاریخ کو ذکر سے پاک کر دیا۔ اس کے علاوہ اولاً اسماعیل علیہ السلام سے ان لوگوں کا بھی ذکر نہیں کیا جن کا سلسلہ نسب آپؐ سے براہ راست نہیں ملتا ہے (تھا)۔

اسی طرح وہ اخبار و روایات اور اشعار بھی حذف کر دیے ہیں، جو ان کے نزدیک ثابت شدہ نہیں ہیں جیسا کہ یہ پہلو ان کے اس قول سے ظاہر ہے: **لم یصحح عندنا من احد من اھل العلم و الشعر** یعنی فن شعروشاعری پر نظر رکھنے والے کسی سے بھی اس کی صحت ثابت نہیں۔

ابن ہشام نے جا بجا غرائب الالفاظ کی تفسیر و توضیح بھی پیش کی ہے۔

ایک خاص پہلو جس کو ابن ہشام نے اس اختصار میں اپنے مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میں ان آرا یا روایات کا اضافہ کر دیا ہے جن سے ابن اسحاق کی روایتوں کی توضیح میں مدد ملتی ہے۔

سیرت نبویؐ کے باب میں مشہور مستشرقین کا تعارف

(۱) الائے اسپرنگر ۱۸۱۳-۱۸۹۳ء

الائے اسپرنگر ایک آسٹرین عیسائی مستشرق تھا جو ۱۸۱۳ میں پیدا ہوا یونیورسٹی آف وی آنا (University of Vieana) سے طبعی اور مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد لندن چلا گیا۔ مسلمانوں میں عسکری علوم وفنون کی تعلیم و تربیت کی تاریخ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ۱۸۴۳ میں کلکتہ آ گیا اور یہاں دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔

۱۸۵۷ء میں سوئزرلینڈ کی یونیورسٹی آف برن (University of bern) میں جرمن یونیورسٹی ہائیڈل برگ سے تدریس کا تعلق قائم کیا۔ ۱۸۹۳ میں فوت ہوا۔

الائے اسپرنگر نے ۱۸۵۱ میں سیرت پر The life of Mohammad کے نام سے کتاب شائع کیا۔ علاوہ ازیں اس نے ہندوستان میں قیام کے دوران عربی اور فارسی کی بعض کتب کو ایڈٹ کر

کے بھی شائع کیا۔اسپرنگر کا کہنا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ توہم پرستی میں مبتلا تھے۔ وہ جنات پر یقین رکھتے تھے، فال نکالتے تھے اور جھاڑ پھونک کرتے تھے۔اسپرنگر قرآن مجید کی آیت وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدیٰ (سورۂ ضحیٰ) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ اپنے دعوائے نبوت سے پہلے بتوں کی عبادت کرتے تھے۔اس کا کہنا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں پیغمبر اسلام ﷺ کے ذہن میں اپنے آباء واجداد کے دین بت پرستی کے بارے میں شکوک وشبہات اور اوہام نے جنم لیا تو مسلمانوں نے اسے وحی کا نزول قرار دے دیا۔

ہمارا کہنا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ میں کوئی ایسی بات نقل نہیں ہوئی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ معاذ اللہ بتوں کی عبادت کرتے تھے۔

اس کی بہترین تفسیر جو علماء اسلام کی ایک جماعت نے کی ہے یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! آپ کے رب نے آپ کو گم راہ لوگوں میں پایا یعنی دورِ جاہلیت اور بت پرستی کے زمانے میں پایا اور ہدایت دی۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو تلاش حق میں سرگرداں پایا اور ہدایت عطا فرمائی۔

آپ نبوت سے پہلے تفصیلی ہدایت یعنی شریعت کی تلاش میں سرگرداں تھے اور اس کے لیے غار حرا میں قیام کے دوران دین ابراہیمی کی باقیات کے مطابق عبادت فرمایا کرتے تھے۔

اسپرنگر کا کہنا ہے کہ ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ محمد ﷺ کی غارِ حرا میں زید سے ملاقات ہوئی ہوگی، جو دین حنیفیت پر تھے۔انھوں نے ہی پیغمبر اسلام ﷺ کے ذہن میں ایک خدا کا تصور ڈالا ہوگا اور ان کی اس طرف رہنمائی کی ہوگی کہ وہ سابقہ آسمانی کتابوں تورات اور انجیل کا مطالعہ کریں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل اسپرنگر کے پاس نہیں ہے اور ہوگی بھی کہاں سے کہ غار حرا میں محمدؐ کی ملاقات زید سے ہوئی ہوگی اور زید نے آپ کو ایک نئے دین کی طرف رہ نمائی کی ہوگی۔اسی لیے تو قرآن مجید ان لوگوں کے بارے میں کہتا ہے: وَمَا لَهُم بِذَٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (جاثیہ:۲۴) ''ان کے پاس ان کے دعویٰ کی کوئی علمی دلیل نہیں ہے یہ محض اٹکل پچو سے کام چلاتے ہیں۔''

اسی طرح اسپرنگر نے آپؐ کی ذات پر یہ الزام لگایا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں یہ کہنا کہ نرم دل تھے، درست نہیں ہے بلکہ وہ اتنے سخت دل تھے کہ انھوں نے ایک قبیلہ کے بعض لوگوں کے

ہاتھ پاؤں کاٹ کرانہیں کھلے میدان میں دھوپ میں پھینک دیا اور وہ بھوک پیاس سے مر گئے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ عکل اور عرینہ قبیلے کے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں مدینہ میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی۔ انہیں مدینہ کی آب وہوا راس نہ آئی اور ان کے پیٹ خراب ہو گئے آپ نے انہیں مدینہ سے باہر بیت المال کے اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا۔ ایک روایت کے مطابق یہ آٹھ کے قریب افراد تھے۔ انھوں نے وہاں قیام کیا تو صحت مند ہو گئے۔ انھوں نے اس چراگاہ کے نگراں صحابی کو اس طرح بے دردی سے قتل کیا کہ ان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیں پھیریں انہیں بھوکا پیاسا پھینک دیا اور بیت المال کے اونٹ ہانک کر بھگا لے گئے۔ آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان کے پیچھے تقریباً بیس صحابہ کی ایک جماعت کو بھیجا، انھوں نے انہیں پکڑا اور مدینہ لے آئے۔ آپؐ نے ان صحابی کا قصاص لیتے ہوئے اور بیت المال کے اونٹوں کی لوٹ مار کی سزا کے طور پر انہیں قتل کرنے کا حکم دیا بلکہ اسی طرح قتل کرنے کا حکم دیا جس طرح انھوں نے چراگاہ کے نگراں صحابی کو قتل کیا تھا۔

عکل اور عرینہ قبیلے کے ان لوگوں کے اس جیسے فعل کو قرآن مجید نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ، فساد فی الارض یعنی دہشت گردی قرار دیا اور اس قسم کے جرائم کے لیے ایسی ہی سخت سزا بیان کی ہے۔ (المائدہ:۳۳)

(۲) ولیم میور (William Miiver)

ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵ء) ایک اسکاٹش مستشرق ہے جو ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا۔ گلاسکو اور ایڈنبرگ کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۳۷ء کو بنگال سول سروس کی جوائن کیا اور شمالی مغربی صوبوں کے گورنر کے سکریٹری کے طور پر اپنی سروس کا آغاز کیا۔ ۱۸۶۵ء میں انڈین گورنمنٹ کا سکریٹری خارجہ مقرر ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں اسے شمال مغربی صوبوں کا لیفٹیننٹ گورنر بنایا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں شاہی ایشیائی سوسائٹی Royal Asiatic Society کا صدر بنا۔ ۱۸۸۵ء میں ایڈبرگ یونیورسٹی کا پرنسپل منتخب ہوا اور ۱۹۰۳ میں ریٹائر ہوا بعد میں یہیں پر ۱۹۰۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔

ولیم میور کے بارے میں اور اس کی زندگی اور اس کے کاموں کے بارے میں ہم کو یہ تفصیل وکی پیڈیا پر ملی ہے:

Works, reception and legacy
Sir Willam Muir was an orientalist and Scholor of Islam. His chief area of expertise was the history of the time of mohammad and the early caliphate. his chief books are A life of Mohammad and history of Islam to the Era of the hegira and rise of Islam.

معروف کتب: The Life of Mohammad and history of Islam to the Era of the hegira جس کی پہلی دو جلدیں ۱۸۵۸ء اور تیسری چوتھی جلد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئیں۔

یہی کتاب بعد میں تہذیب و تنقیح کے ساتھ The life of Mohammad from original sources کے نام سے ۱۸۷۸ میں شائع ہوئی۔

خلافت پر ایک کتاب The Caliphate: Its rise, decline and fall. کے نام سے لکھی۔

علاوہ ازیں کتب سیرت اور تاریخ میں Mohammad and Islam اور The Rise and Decline of Islam. ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں سیرت پر ایک کتاب The Mohammad Controversy کے نام سے شائع ہوئی۔

ولیم میور کی اس کتاب کا جواب دینے کے لیے سر سید احمد خانؒ نے لندن کا سفر کیا اور **الخطبات الاحمدیة فی العرب و السیرت المحمدیة** کے نام سے سر ولیم میور کے رکیک اعتراضات کا جواب دیا۔ یہ کتاب اردو میں ''خطباتِ احمدیہ'' کے نام سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی لندن میں شائع ہوا۔

(۳) ڈیوڈ صموئیل مارگولیستھ (David Samuel Margoliouth)

ڈیوڈ صموئیل مارگولیتھ (۱۸۵۸-۱۹۴۰) لندن میں پیدا ہوا۔ چرچ آف انگلینڈ کے ایک متحرک پادری کے طور پر شہرت حاصل کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک عربی زبان کا استاذ رہا۔ اس کے والد یہودی سے عیسائی تھے۔ 1905 میں شاہی ایشیائی سوسائٹی Royal Asiatic Society کا ممبر بنا اور ۱۹۳۴ء تک اس کا صدر رہا۔ عربی کتابوں کی ایڈیٹنگ اور ترجمے کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ یہاں تک کہ مصری شاعرِ احمد شوقی نے اپنے نظم ''نیل'' کا انتساب اس کی

طرف کیا۔معروف کتاب میں Mohammad and Rise of Islam ہے۔یہ کتاب ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں بنی امیہ اور بنی عباس پر ایک کتاب Umayyads and Abbasids. کے نام سے شائع کی۔

۱۹۱۴ء میں The Early Development of Mohammadanism کے نام سے فقہ اسلامی کی تاریخ پر ایک کتاب مرتب کی۔

اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے سفر معراج کو بھی ایک خواب قرار دیا۔اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ محمد ﷺ نے عیسائیت کے بارے میں زیادہ بہتر معلومات سفر شام کے دوران وہاں سے حاصل کیں اور انہیں قرآن مجید میں شامل کیا۔مدینہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مہر علی نے اس کے نظریات کا کافی و شافی رد اپنی کتاب سیرت نبوی اور مستشرقین میں کیا ہے۔اس کتاب کو شاہ فہد پرنٹنگ پریس نے شائع کیا ہے اور انگریزی زبان میں ہے۔

ولیم منٹگمری واٹ (William Montgomery watt)

ولیم منٹگمری واٹ (۱۹۰۹-۲۰۰۶ء) ایک برطانوی مستشرق تھا۔اسکاٹش چرچ سے بطور پادری وابستہ رہا۔اسی طرح ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۹ء تک بطور استاذ علوم اسلامیہ اور عربی زبان یونیورسٹی آف ایڈنبرگ سے بھی وابستہ رہا۔یونیورسٹی آف ٹورنٹو اور جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں بھی وزٹنگ پروفیسر رہا ہے۔منٹگمری کو آخری مستشرق The Last Orientalist کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔

قرآن مجید پر اس کا ایک مقدمہ Introduction to the Quran کے نام سے ہے، جو ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔معروف کتب میں سیرت پر دو کتابیں Mohammad at Mecca اور Mohammad at Madina ہیں جو بالترتیب ۱۹۵۲ اور ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

ان دونوں کتابوں کا خلاصہ Mohammad Prophet and Statesman کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

اس کے علاوہ کتب میں Islamic philosophy and Theology اور Islamic patitical Thought شامل ہیں۔

منٹگمری واٹ بھی مشنری عیسائی تھا۔ اگر چہ اپنی تحریروں میں اللہ کے رسولؐ کی جا بجا تعریف بھی کرتا ہے۔ لیکن جب سوال آپؐ کی نبوت اور رسالت کا ہوتا ہے تو وہاں ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتا۔ ایک جگہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ محمد ﷺ پیغمبر تھے یا نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ وہ تخلیقی نوعیت کے عظیم مفکر اور مصلح تھے جنھوں نے اپنی عرب قوم کو ایک ایسا نظام زندگی دیا جو اس سے بہت بہتر تھا جو ان کے پاس محمدؐ کی آمد سے پہلے موجود تھا۔ منٹگمری واٹ وہ پہلا مصنف ہے جس نے سیرت پر مستشرقین کو یہ منہج دیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعریف خوب کرو لیکن انہیں پیغمبر نہ مانو۔

آج سادہ لوح مسلمانوں کی ایک جماعت ایسے مستشرقین کے آپؐ کے حق میں کلمۂ خیر کو بڑے فخر سے بیان کرتی ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مستشرقین ایک باقاعدہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت محمدؐ کی تعریف بیان کرر ہے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ محمد ﷺ کو ایک عظیم مفکر، مصلح مخلص اور محنتی انسان کے طور پر دنیا میں متعارف کروادو اور دنیا انہیں بس اتنا ہی سمجھے اور ان کی پیغمبرانہ حیثیت کو کسی صورت بھی قبول نہ کرے۔

تحریکِ استشراق

اور جدید مفکرین پر اس کے اثرات

ایاز حسام الدین

مسلم دنیا کے جدید تعلیم یافتہ دانشور اور اسکالرز کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد مستشرقین کے زیر اثر ہے۔ یہ اثرات ان دانشوروں میں عام دکھائی دیتے ہیں جو مغرب میں جا کر اس کی ثقافت واقدار سے مرعوب ومتاثر ہوئے یا مغربی یونیورسٹیوں میں مغربی اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔(۲) کینسٹویل اسمتھ نے مسلم فکر کی آزاد خیالی کا سوراغ لگاتے ہوئے اس حقیقت کو ان الفاظ مین بیان کیا ہے:

> ''مسلم آزاد خیالی کا تیسرا سبب مغرب کا نفوذ ہے۔ بہت سے مسلمان مغرب میں گئے اور اس کی روح اور اس کے اقدار سے واقفیت حاصل کی اور اس کے مداح بنے۔ یہ چیز بالخصوص ان طلبہ کے معاملے میں حقیقت ہے جو بڑی تعداد میں مغرب کی یونیورسٹیوں میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔(۲)

ا۔ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مصر کے معروف اسکالر ڈاکٹر طٰہٰ حسین (1889-1973) نے مصری مسلمانوں کو مغربی تہذیب اپنانے کی پرزور دعوت دی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مصری زندگی اپنے مظاہر کے اختلاف کے ساتھ خالص مغربی ہے، ہمیں یورپ کے طریقے پر چلنا چاہیے اور انہیں کی سیرت وآداب کو اختیار کرنا چاہیے۔ در حقیقت عصر حاضر میں ہمیں یورپ سے ایسا رابطہ چاہیے جو روز بروز بڑھتا رہے یہاں تک کہ ہم لفظ اور معنی، حقیقت اور شکل ہر اعتبار سے یورپ کا ایک حصہ بن جائیں۔ ہم نے سب کچھ یورپ سے لیا ہے۔ دستور وحکومت کی کوئی ایک شئے بھی ہے، جس میں ہم نے یورپ کی بعینہ نقالی نہ کی ہو! ہمیں یورپ سے اسی طرح مسلسل استفادہ کرتے رہنا چاہیے تا آں کہ وہ ہمارے جسم وروح، عقل وضمیر اور خون میں اتر جائے۔(۳) اس کی محبت ہماری روحوں کی غذا ہمارے مدرکات کی امام اور ہمارے ضمیروں کا امام بن جائے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین عربی ادب کو دینی علوم سے یکسر آزاد کرنے کے حامی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں تحقیق پر قومی احساسات اور مذہبی رجحانات و میلانات کو بالائے طاق رکھ کر اس فلسفیانہ طریقہ کا اطلاق کرنا چاہتے ہیں، جس کی ابتدا ڈی کارٹ نے کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ دینی اثرات کے لیے عربی ادب کے مطالعہ کی مخالفت کرے اور واضح کرتے ہوئے کہ اس کا مطالعہ بطور ادب ہی سمجھنا چاہیے۔ مذہب کو ذاتی سطح پر رہنا چاہیے۔(۴) ڈاکٹر طہٰ حسین لکھتے ہیں:

''آخر کیوں میں ادب کا مطالعہ اس لیے کروں کہ اہل سنت کی مدح اور معتزلہ، شیعہ، خوارج کی مذمت میں عمر کھپادوں حالاں کہ نہ مجھے اس سے کوئی سروکار ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ اور علمی مقصد۔ مجھے کون مجبور کر سکتا ہے کہ میں اسلام کی تبلیغ اور الحاد کی تردید کرنے والا بنوں جب کہ میں نہ مبلغ ہوں نہ مبلغ بننا چاہتا ہوں اور نہ ملحدین سے مناقشہ کرنے کا خواہش مند ہوں جن کو میں بس اپنے اور اللہ کے درمیان ہی خیال کرتا ہوں۔''(۵)

۲۔ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ڈاکٹر فضل الرحمٰن (1988-1999) پاکستانی اسکالر اور دانشور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو مغربیت اختیار کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ مغربی تہذیب اپنانے کے باوجود مسلمان مکمل مسلمان رہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سے تصورات مستشرقین کے تتبع میں اپنائے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ بعض مسلم اور غیر مسلم اسلام کو ایک مخصوص طرز زندگی سمجھتے ہیں، جس میں مشکل ہی سے کوئی تبدیلی ممکن ہے حالاں کہ اسلام کے بہت سے غیر مسلم طالب علم تھے مثلاً پروفیسر، گستاف، اے وان گرونی بام کے نزدیک اسلام دراصل کسی تہذیب و ثقافت کا نام نہیں بلکہ قرآن و سنت کے فراہم کردہ کچھ اصول و ضوابط کا نام ہے، جس میں وقت اور ضروریات سے توافق اور تطابق کی گنجائش پائی جاتی ہے۔(۶) ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے حدیث پر اعتراضات اٹھائے اور اسے نشانۂ تنقید بنایا ہے۔ حدیث کے حوالے سے ان کا نظریہ جوزف شاخت سے واضح تاثر لیے ہوئے ہے۔ وہ شاخت ہی کی طرح حدیث و سنت کو ابتدائی مسلم سوسائٹی کی عملی زندگی کا لفظی اظہار قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حدیث کا یہ مواد وقت کے ساتھ ساتھ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہا ہے۔ مختلف لوگوں کی ذاتی آرا کو بعد میں حدیث کے باقاعدہ نظام کی شکل دے دی گئی۔ وہ حدیث کو ایک تاریخی افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث ایک تاریخی افسانے کے سوا کچھ نہیں جس کا مواد مختلف ذرائع سے جمع ہوا۔''(۷)

۳۔ محمد عبدہ

عالم عرب میں تجدد پسندانہ تعبیر اسلام کے حوالے سے سب سے نمایاں نام مفتی محمد عبدہ (1849-1905) کا ہے۔ جامعہ الازہر میں ان کی پہچان سب سے بڑی تجدد پسند سے کی گئی۔ مفتی محمد عبدہ نو جوانی ہی سے مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ یہ حقیقت الاہرام کے (اس زمانے کا مصر کا ایک ہفت روزہ اخبار جو بعد میں روز نامہ بن گیا) خیر مقدم کے طور پر لکھے گئے مفتی کے اس مقالے سے عیاں ہوتی ہے جس میں انھوں نے لکھا کہ مغربی ممالک کی تہذیب مصر ہی سے وہاں پہنچی جہاں نشیب و فراز سے گزر کر اب وہ عروج کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ مصر سے جلاوطنی کے بعد جب عبدہ نے مختلف یورپی ممالک کا سفر کیا تو انھوں نے اس حوالے سے اور تحریک پائی۔ رشید رضا کے مطابق جلاوطنی کے بعد پہلی دفعہ تو عبدہ نے مجبوری کے تحت یورپ کا سفر کیا لیکن بعض ازاں دلچسپی اور شوق سے بار بار یورپ گئے۔

مفتی عبدہ کا کہنا تھا کہ اسلام اپنی دعوت میں عقل پر انحصار کرتا ہے۔ معجزات یا فوق العادات واقعات سے انسان کو متحیر نہیں کرنا چاہتا۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ ایمان باللہ، ایمان بالرسل پر مقدم ہے لہٰذا ایمان باللہ کو انبیاء کے الفاظ پر منحصر کرنا درست نہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ امکان نبوت کا قائل ہوئے بغیر اللہ کی ہستی پر ایمان لے آئے۔ انسان کو تقلیداً نہیں عقل سے ایمان لانا چاہیے۔ کلام الٰہی کا لفظی معنی اور تقاضائے عقل میں اختلاف ہو تو عقل کو ترجیح دینی چاہیے۔(۸) مفتی عبدہ نے جدید تصورات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے قرآنی آیات میں تاویلی امکانات کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔

يَـا أَيُّهَـا الـنَّـاسُ اتَّـقُـواْ رَبَّـكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَة (النساء:۱) کی تفسیر میں مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ آدم سے مراد ہر نسل کا الگ مورث اعلیٰ مراد لیا جا سکتا ہے۔(۹)

۴۔ رشید رضا

جہاں تک مفتی عبدہ کے شاگردوں اور متبعین کا تعلق ہے، ان میں سب سے نمایاں اور اہم محمد رشید رضا (1865-1935) ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن بنیادی طور پر ایک روحانی کتاب ہے، جس میں

دنیوی امور سے متعلق بہت کم احکام ملتے ہیں۔زیادہ تر اختیارات اولی الامر کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام بہبود عامہ کو پیش نظر رکھ کر فیصلے کیا کرتے تھے گویا بعض اوقات ان کے فیصلے سنت کے خلاف بھی ہوئے۔گویا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ شرعی تفصیلات کی بجا آوری ضروری نہیں، بنیادی مصلحت فلاح عامہ کی رعایت ہے۔(۱۰) رشید رضا کے نزدیک احادیث بھی بحیثیت مجموعی قابل اعتنا نہیں بلکہ صرف وہی احادیث قابل قبول ہیں جو عملی نوعیت کی ہیں اور جن پر امت مسلمہ میں مسلسل عمل کا ثبوت ملتا ہے۔رشید رضا بخاری وغیرہ کی ان احادیث، جن میں انسانوں کے جنوں کو دیکھ سکنے یا جن میں آپؐ کے معجزات یا آپ پر جادو ہونے کا ذکر ہے، نا قابل اعتبار ٹھہرایا ہے۔اپنے نظریے سے میل نہ کھانے والی احادیث کو ایک مقام پر ان الفاظ میں رد کیا ہے۔''حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں۔''(۱۲) جنات کے حوالے سے متکلمین کے اس نقطۂ نظر کو بیان کرنے کے بعد کہ جنات نظر نہ آنے والے اجسام ہیں، ان کے جراثیم ہونے کے امکان ظاہر کرتے ہوئے رشید رضا نے لکھا ہے:

> ''متکلمین کا کہنا ہے کہ جن نظر نہ آنے والے زندہ اجسام ہیں۔ہم المنار میں کئی دفعہ بیان کر چکے ہیں کہ زندہ اور نظر نہ آنے والے اجسام جو عصر حاضر میں بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعے دیکھے گئے ہیں، اور جنھیں جراثیم کہا گیا ہے۔ممکن ہے جنوں کی نوع میں سے ہوں۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جراثیم ہی اکثر بیماریوں کا موجب ہیں۔''(۱۳)

معجزات سے متعلق رشید رضا کی رائے تھی کہ اب معجزات کا زمانہ گزر گیا۔یہ اس وقت کا قصہ ہے جب انسانیت ابھی عہدِ طفولیت میں تھی۔اسلام کی آمد کے ساتھ ہی انسان ذہنی بلوغ کے زمانے میں داخل ہو گیا اور معجزات کا زمانہ جاتا رہا۔ان کے معجزات وخوارق کو فعلی رنگ دینے کی ایک مثال یہ ہے کہ وہ سورۂ یوسف آیت ۹۴ کی تفسیر میں خوشبوئے یوسف کے معجزانہ تصور کو قابل التفات نہ سمجھتے ہوئے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ صاف اور سیدھی بات ہے کہ یہ کوئی جنت کی خوشبو نہ تھی بلکہ قمیص کی یہ بو یوسف علیہ السلام کے جسم کی بو تھی۔

۵۔سر سید احمد خان

قرآن کی جس طرز کی متجددانہ تعبیر کی بنیاد عالم عرب میں مفتی محمد عبدہ نے رکھی تھی برصغیر میں اس

طرز کی متجددانہ تفسیر قرآن کے بانی سرسید احمد خان ہیں۔ سرسید عبدہ سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے قرآنی بیانات کو جدید تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے متفق علیہ تفسیری اصولوں کو بالکل نظر انداز کر دیا، ان کے نزدیک قرآن اور دیگر آسمانی کتب میں معجزات کا جو ذکر ہے وہ تمثیلی و استعاراتی یا افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ سرسید نے سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کی تفسیر میں معراج جسمانی سے متعلق تمام احادیث کو ناقابل اعتبار اور ان کے بیان کو خلاف قانون قدرت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''واقعات خلاف قانون فطرت کے وقوع کا ثبوت اگر گواہان روایت بھی گواہی دیں تو محالات سے ہیں اور معراج رسولؐ کو خواب میں پیش آنے والا رؤیا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے (۱۴) جو صرف ایک مثال ہے، ورنہ وہ قرآن میں کہیں بھی معجزہ مذکورہ ماننے سے انکاری ہیں۔ بنی اسرائیل کے عبورِ دریا اور موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کے دیگر معجزات کی بھی انھوں نے عجیب و غریب تاویلات کی ہیں۔ (۱۵) سرسید حدیث، اجماع اور قیاس وغیرہ کو اصول دین میں شامل نہیں سمجھتے۔ وہ تمام ملائکہ، شیطان اور جنات کا بھی خارجی وجود تسلیم نہیں کرتے۔ (۱۶)

۶۔ راشد شاذ

راشد شاز کی موجودہ فکر کا حاصل اور لب لباب یہ ہے کہ وہ دین جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا، اب محفوظ و موجود نہیں ہے۔ (۱۷) شخصیات نے جنھیں مسلمان اپنے عظیم ائمہ اور سلف صالحین سمجھتے ہیں، دین میں ایسی تحریف کی کہ وہ ''ایک منجمد اور بے روح مذہب'' ہو گیا۔ (۱۸) ان کے نزدیک دین کے محفوظ نہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ وہ نماز جسے مسلمان رسول اللہؐ کے زمانے سے اب تک روزانہ پانچ بار اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں اور جس کی تعلیم رسول اللہؐ نے اپنے لاکھوں صحابہ کو اور صحابہ نے اگلی نسل کے کروڑوں افراد کو اور پھر ہر نسل کے مسلمانوں نے اپنی اگلی نسل کے کروڑوں لوگوں کی، اس نماز کے بارے میں بھی شاز صاحب کا خیال ہے کہ وہ اب محفوظ نہیں رہی۔ ان کا کہنا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد کی نمازیں کچھ اور تھیں اور آج کی نمازیں اس سے مختلف ہیں۔ (۱۹) ان کے مطابق پوری امت مشرک ہے۔ (۲۰) مساجد اور مدارس کی بابت ان کا نظریہ ہے کہ مسجدیں ہوں یا مدرسے بظاہر ان پر دین داری کا کتنا ہی خوشنما ملمع کیوں نہ چڑھا ہو اور ان کے مناروں سے اللہ اکبر کی صدا کیوں نہ سنائی دیتی ہو در اصل توحید کے مراکز نہیں بلکہ شرک اور بت پرستی کے اڈے ہیں۔ (۲۱)

مراجع ومصادر

۱- فکر استشراق اور عالم اسلام میں اس کا اثر ونفوذ، ڈاکٹر محمد شہباز منج ،القمر پبلی کیشنز لاہور

۲- ایضاً ص ۸۶

۳- مستقبل الثقافۃ فی مصر، طہٰ حسین، دار المعارف قاہرہ، ص ۳۱-۴۴

۴- فی الادب الجاہلی، طہٰ حسین، ص ۶۵

۵- فکر استشراق اور عالم اسلام میں اس کا اثر ونفوذ، ڈاکٹر محمد شہباز منج ،القمر پبلی کیشنز لاہور

۶- Islam Fazlur Rahman Page 56

۷- Islam Fazlur Raham Page 14

۸- الاسلام والعصرانیۃ، محمد عبدہ، صفحہ ۵۱

۹- ایضاً، ص ۵۵-۵۴

۱۰- تفسیر المنار، رشید رضا، قاہرہ دار المنار، ج ۶ ص ۵۶۳

۱۱- ایضاً، ج ۲، ۷، ۳

۱۲- ایضا! ،جلد ۷۔ ۵۱۶۷

۱۳- ایضا، جلد ۳۔ ۷۔ ۹۶

۱۴- تفسیر القرآن مع اصول تفسیر، سرسید احمد خان، لاہور، ص 1075، 1197

۱۵- ایضاً، ص ۱۶۲، ۱۴۷

۱۶- ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۸

۱۷- اسلام، مستقبل کی بازیافت، راشد شاذ، ص ۱۴

۱۸- متحد اسلام کا منصور، راشد شاذ، ص ۱۴

۱۹- ادراک زوال امت، راشد شاذ، ص ۳۳۲-۲۳۵

۲۰- اسلام، مستقبل کی بازیافت، ص ۶۱

۲۱- متحد اسلام کا منصور، ص ۱۵

امام زہری اور مستشرقین

محمد عاصم

مستشرقین نے اسلام کے بنیادی مصادر میں سے حدیث پر خاص طور سے اعتراضات کیے ہیں اور ذخیرۂ احادیث کو وضع قرار دیا ہے، اور اس ضمن میں امام زہریؒ جن کو احادیث کا امام مانا جاتا ہے ان پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

تعارف

آپ کا نام ونسب محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب بن عبداللہ بن حرث ابن زہرہ القرشی الزہری ہے۔ صحیح تر قول کے مطابق آپ ۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مسلم بن عبید اللہ تھا۔ آپ کے والد بنی امیہ کے خلاف لڑی گئی جنگوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دست راست تھے۔ جب آپ کے والد نے وفات پائی تو زہری ایک فقیر نوجوان کی صورت میں تن تنہا رہ گئے۔ مال ومتاع سے خالی اور تنگ دست یتیم تھے۔ کوئی سر پرست نہ تھا جو ان کو سہارا دے سکے۔ صرف ایک بڑا بھائی تھا جس کے بارے میں تاریخ کلیۃً خاموش ہے۔

آپ نے حفظ قرآن ۸۰ راتوں میں مکمل کرلیا۔ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اس کے بعد عبداللہ بن ثعلب سے علم الانساب سیکھنے لگے۔ پھر حلال وحرام اور روایت حدیث کی جانب توجہ مبذول کی۔ اور جن صحابہ کرام کی صحبت میسر آسکی ان سے ملے۔ امام زہری کی زندگی میں ۱۰ اصحابہ کرام بقید حیات تھے ان میں سے انسؓ، ابن عمرؓ، جابرؓ اور سہیل بن سعد بھی تھے۔ کبائر تابعین کی بھی صحبت اختیار کی مثلاً: سعید ابن مسیّبؒ، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبد الرحمٰن وغیرہ۔ انھوں نے سب سے زیادہ استفادہ سعید ابن مسیّب سے کیا۔ آپ نے بلوغت کے بعد پہلی مرتبہ مروان کے زمانے میں شام کا سفر کیا۔ اموی خلفاء

کے پاس بھی آپ آتے جاتے تھے اور عراق اور مصر میں بھی آمد و رفت رکھتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۲۴ھ میں ''ادای'' نامی جگہ میں (جہاں ان کی اراضی تھی اور جو حجاز کی آخری سرحد اور فلسطین کے نزدیک واقع ہے) ہوئی۔ آپ کی وفات ۷۴ سال میں ہوئی۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ مجھے شاہراہ عام پر دفن کیا جائے تا کہ ہر گزرنے والا دعائے خیر سے یاد کرے۔

نمایاں اخلاق وصفات

امام زہریؒ بہت سخی تھے۔ جو بھی ان کے پاس سوال کرنے والا آتا اسے کچھ نا کچھ نہ ضرور دے کر واپس کرتے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے پاس کچھ نہ ہوتا تو دوستوں سے قرض لے کر دیتے تھے۔ اگر آپ کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو آپ کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ آپ طویل سفر کر کے دیہات میں جاتے اور بدوؤں کو تعلیم دیتے۔ کثرت جود و کرم میں بار بار مقروض ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات اموی خلفاء یہ قرض ادا کرتے اور بعض دفعہ ان کے احباب واعوان۔ آپ حد درجہ محنتی طالب علم تھے۔ علماء سے ملاقات کے شائق تھے جو کچھ علماء سے سنتے اسے محفوظ کر لیتے، رات کو دیر تک جاگتے اور جو کچھ سنا ہوتا اس کو یاد کرتے۔

امام زہریؒ کی علمی شہرت

اساتذہ کی خدمت آپ کا شیوہ تھا۔ آپ کے قوتِ حافظہ اور علمی صداقت و امانت کا لوگوں میں بہت چرچا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور دور تک آپ کی شہرت پہنچ گئی اور لوگ طلب علم کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

امام ذہبی تذکرہ الحفاظ میں اور حافظ ابن عساکر تاریخ میں لکھتے ہیں کہ لیث بن سعد نے لکھا:

> ''میں نے زہری سے بڑھ کر جامع عالم نہیں دیکھا۔ جب ترغیب و ترہیب کے بارے میں حدیثیں روایت کرتے تو ہم کہتے یہ صرف یہی جانتے ہیں اور اگر قرآن و سنت کے بارے میں کچھ فرماتے تو آپ کی بات بڑی جامع ہوتی۔''

امام مالک نے روایت کیا ہے کہ امام زہری مدینہ آئے تو ربیعہ کا ہاتھ پکڑا اور کمرہ میں داخل ہو گئے۔ جب عصر کا وقت ہوا تو زہری باہر نکلے اور وہ کہہ رہے تھے ''مدینہ میں ربیعہ جیسا کوئی شخص نہیں''

اور ربیعہ نکلے اور وہ کہہ رہے تھے ''میرے خیال میں زہری علم میں سب پر فوقیت لے گئے ہیں۔''

حدیث میں امام زہریؒ کا مقام

ابن حاتم نے الجرح والتعدیل میں اور حافظ ابن عساکر اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ عمر بن عبد العزیز نے ایک دن اپنے ہم نشینوں سے کہا: کیا تم ابن شہاب زہری کے یہاں جاتے ہو؟ انھوں نے کہا جی ہاں! عمر بن عبدالعزیز نے کہا اس کے یہاں ضرور جایا کرو، ان سے بڑھ کر حدیث کا علم رکھنے والا آج اور کوئی موجود نہیں۔

علی بن مدینی فرماتے ہیں: حدیث کے عظیم عالم حجاز میں زہری اور عمرو بن دینار ہیں۔ یہ سن کر سفیان نے کہا: لوگوں میں زہری سے بڑھ کر سنت کا علم رکھنے والا اور کوئی نہ تھا۔ علماء بے شمار موجود ہیں کہ زہری اپنے زمانے میں حدیث کے یکتائے روزگار فاضل تھے۔ ابن عساکر کے قول کے مطابق اس کی وجہ خود زہری نے یہ بیان کی ہے کہ ''میں نے ۳۵، ۳۶ سال کا تھا نہیں بلکہ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ امام زہری کہتے ہیں کہ میں نے ۳۵، ۳۶ سال کا عرصہ اہل شام کی حدیثیں اہل حجاز کی جانب اور اہل حجاز کی مرویات اہل شام کی طرف منتقل کرنے میں گزارا۔ چنانچہ کوئی شخص مجھے ایسی احادیث نہ سناتا جو میں نے خود نہ سنی ہو۔''

امام زہریؒ کی خدمات حدیث

امام زہری نے حدیث کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سے اہم ترین تین ہیں:

۱۔ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے امام زہری نے حدیثیں مدون کیں۔ امام زہری اولین شخص تھے جس نے عمر بن عبدالعزیز کے ایماء پر حدیثیں جمع کی تھیں۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں: سب سے پہلے علم کی تدوین کا شرف امام زہری کو حاصل ہوا۔ حافظ ابن عساکر اور عبدالبر نے بھی تدوین حدیث کی نسبت امام زہری کی جانب کی ہے۔

۲۔ امام زہری نے بہت سی احادیث حفظ کی تھیں۔ اگر وہ ان کو حفظ نہ کرتے تو وہ ضائع ہو جاتیں۔ ابن عساکر لیث سے روایت کرتے ہیں کہ ''سعید بن عبدالرحمٰن بن حنبل نے ان سے کہا: اے ابوالحارث! اگر زہری نہ ہوتے تو بہت سی احادیث ضائع ہو جاتیں۔ امام مسلم

اپنی کتاب صحیح مسلم کے کتاب الایمان والنذ ور میں امام زہری سے، ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو معتبر سند کے ساتھ منقول ہیں اور زہری کے سوا اور کسی نے روایت نہیں کیں۔

۳- زہری اولین شخص تھے جن کو حدیث کی سند کا احساس ہوا۔ قبل ازیں لوگ سند کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ امام مالک فرماتے ہیں: سب سے پہلے زہری نے اسناد حدیث روایات کرنا شروع کی غالباً زہری نے ملک شام میں ایسا کیا۔

ابن عساکر ولید بن مسلم سے روایت کرتے ہیں کہ امام زہری نے فرمایا: ''اہل شام! کیا بات ہے کہ تمہاری احادیث باگ ڈور اور لگام سے خالی ہے۔ اس روز سے ہمارے اصحاب نے حدیث کی سند کا اہتمام کرنا شروع کر دیا۔

امام زہریؒ کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کی آراء

ابن سعد لکھتے ہیں: ''زہری بہت بڑے عالم حدیث، کثیر از روایت فقیہ اور جامع عالم تھے۔'' امام نسائی فرماتے ہیں: بہترین اسانید جن کے ذریعے رسول کریم ﷺ سے حدیثیں روایت کی جاتی ہیں چار ہیں:

۱- زہری از علی بن حسن وہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے

۲- زہری از عبید اللہ از ابن عباس آپ نے امام زہری کی دوسندیں اور ذکر کی ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں: زہری حدیث روایت کرنے میں سب سے اچھے ہیں۔ ان کی اسناد سب سے اعلیٰ ہوتی ہیں۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے: ابوزرعہ سے کون سی اسانید صحیح تر ہے؟ فرمایا چار ان میں سے پہلی زہری از سالم از والد خود ہیں۔

ابن حبان کتاب الثقات میں لکھتے ہیں: آپ نے ۱۰ صحابہ کو دیکھا تو آپ یگانہ روزگار حافظ حدیث تھے۔ آپ حدیث کا متن سب سے بہتر بیان کرتے تھے۔ آپ بڑے فقیہ اور فاضل تھے۔ لوگ آپ سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔

صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے بتایا ''زہری مدینہ کے رہنے والے ثقہ تابعی تھے۔'' حافظ ابن حجر ''تہذیب التہذیب'' میں رقم طراز ہیں: ''زہری مدینہ کے رہنے والے جلیل القدر حافظ حدیث امام اور حجاز وشام کے ممتاز عالم تھے۔ اسی طرح ائمہ حدیث حفاظ اور علمائے جرح تعدیل

آپ کی امانت وجلالت اور توثیق کے بارے میں یک زبان ہیں۔

امام زہریؒ کے اصحاب وتلامذہ

لاتعداد لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا۔مشہور ترین تلامذہ حسب ذیل ہیں: امام مالک، امام شافعی، عطاء بن ابی رباح، عمر بن عبدالعزیز، ابن عیینہ، لیث بن سعد، اوزاعی، ابن جریج۔

مندرجہ ذیل محدثین نے اپنی کتاب میں امام زہری کی مرویات کو جگہ دی ہے: بخاری، مسلم، سنن اربعہ، موطا امام مالک، مسند شافعی، مسند احمد۔ کسی حدیث کی سند ایسی نہیں جس میں زہری کی روایت کردہ احادیث موجود نہ ہوں۔ اس طرح حدیث کے ابواب میں سے کوئی باب ایسا نہیں جس سے متعلق امام زہری کی کوئی حدیث یا اثر ورائے پائی نہ جاتی ہو۔

امام زہریؒ پر وارد کردہ اعتراضات اور ان کا جواب

فن حدیث میں امام زہری کا منصب ومقام اور ان کے بارے میں علماء کے افکار وآراء کو آپ نے پڑھ لیا ہے۔ ان میں سے کسی ایک عالم نے بھی زہری کو ناکردہ گناہ کا مجرم نہیں ٹھہرایا اور نہ ہی ان کی علمی امانت ودیانت کے بارے میں کسی شک وشبہ کا اظہار کیا۔ اس سے بڑھ کر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہودی مستشرق گولڈ زیہر سے پہلے دنیا کے کسی شخص نے حدیث نبوی میں امام زہری کی صداقتِ بیان کو شک وشبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔

اعتراض ا: گولڈ زیہر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام زہری اور بنی امیہ کے مابین جو روابط ومراسم پائے جاتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مجبور کیا کہ وہ ان کے حسب خواہش حدیثیں وضع کریں۔ علماء کے تعلقات قدیم زمانے سے خلفائے وملوک کے ساتھ رہے ہیں۔ مگر اس سے ان کی امانت ودیانت کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ امام زہری جیسا فاضل جب خلفاء سے ملے گا یا خلفاء ان کی زیارت سے مشرف ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے ان کے دین امانت یا ورع وتقویٰ پر کوئی اثر پڑے۔ البتہ اس سے مسلمانوں پر یہ خوش گوار اثر پڑے گا کہ ان کا ایک فاضل استاد علمی حلقہ سے اٹھ کر خلفاء کی مجلس کی زینت بنتا ہے۔ ان کو کوئی حدیث سناتا ہے، کسی علمی مسئلہ پر اظہار خیال کرتا ہے۔ کسی شرعی حکم کی توضیح کرتا ہے۔ ان کے بچے کو شرعی تعلیم دیتا ہے۔ ان کو بتاتا ہے کہ امت کے کون سے حقوق ان پر

عائد ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کون سے واجبات وفرائض ان پر واجب الادا ہیں۔

گولڈ زیہر نے امام زہری کے تعلق سے جو دعویٰ کیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ امام زہری کے زندگی کا ایک واقعہ ایسا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام زہری نے خلفاء کے خواہش کے مطابق حدیثیں وضع نہیں کیں۔

عقد الفرید میں لکھا ہے کہ امام زہری خلیفہ ولید بن عبدالملک کے یہاں گئے۔ ولید نے کہا وہ کیسی حدیث ہے جو اہل شام ہمیں سناتے ہیں؟ زہری نے کہا امیر المومنین وہ کیا ہے؟ ولید نے کہا اہل شام یہ حدیث سناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو رعیت سپرد کرتے ہیں تو اس کی نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور برائیاں نہیں لکھی جاتیں۔ زہری نے کہا: امیر المومنین یہ جھوٹ ہے۔ کیا ایک خلیفہ جو نبی بھی ہو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ باعزت ہے یا صرف خلیفہ جو نبی نہ ہو؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٴدؑ کے بارے میں سورہ ص آیت ۱۶ میں کہا: وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَاب. ولید نے یہ سن کر کہا: ''لوگ کس طرح ہمیں دین سے منحرف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ نہ زہری خلیفہ ولید کے سامنے جھکے اور نہ ہی ان کے خیالات کو تسلیم کیا اور نہ ہی اس کی رضامندی کے لیے کوئی حدیثیں گڑھیں۔

اعتراض ۲: گولڈ زیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ عبدالملک نے قبۃ الصخرۃ تعمیر کر کے اہل شام وعراق کو خانہ کعبہ کے حج سے باز رکھنا چاہا تھا۔ عبدالملک نے صخرہ کی تعمیر کو دینی رنگ دینا چاہا۔ چنانچہ زہری نے اس کے لیے یہ حدیث وضع کر دی: ''لا تشد الرحال'' گولڈ زیہر کی یہ بات زمانہ کے عجائبات میں سے ایک ہے۔

اس اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ: ''معتبر مورخین کے یہاں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے کہ صخرہ کی تعمیر ولید کے ہاتھوں انجام پائی تھی نہ کہ عبدالملک کے ہاتھوں۔ اگر اس طرح کی کوئی بھی بات ہوتی تو مورخین اسے فوراً قلم بند کرتے کیوں کہ مورخین نے اس سے بہت کم اہمیت والے واقعات نوٹ کیے ہیں مثلاً علما کی تاریخ پیدائش وغیرہ۔

۲- صخرہ کا واقعہ جس طرح گولڈ زیہر نے بیان کیا ہے بالکل باطل ہے اس لیے کہ کوئی ایسی عمارت تعمیر کرنا جس کے حج کے لیے لوگ آئیں کفر ہے۔ پھر عبدالملک اس کی جسارت کیوں کر کر سکتا تھا؟

عبدالملک اس قدر عبادت گزار تھا کہ لوگ اسے حمامۃ المسجد کہا کرتے تھے۔

۳-اور یہ دلیل بری طرح سے اس بات کی کاٹ کررہی ہے کہ انھوں نے قبۃ الصخرۃ کے تعلق سے حدیث گھڑی۔ کیوں کہ زہری ۵۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور حضرت عبداللہ بن زبیر ۷۳ھ میں قتل کیے گئے تھے۔ ان کے قتل کے وقت زہری ۱۴، ۱۵ سال کے تھے۔ یہ کس طرح صحیح ہے کہ اس قدر چھوٹی عمر میں زہری پوری امت اسلامیہ میں اس حد تک مشہور ہوں کہ ان کی صخرہ کا حج کرنے سے متعلق وضع کردہ حدیث کو عام طور سے قبول کرلیا جائے اور حج کعبہ کو ترک کردیا جائے۔ یہ بالکل غلط بات ہے اور عقل کے باہر ہے۔

۴-تاریخی حقائق سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ عبداللہ بن زبیر کے زمانے میں زہری عبدالملک سے آگاہ ہی نہ تھے۔ ذہبی کے بیان کے مطابق زہری کی ملاقات عبدالملک سے ۸۰ھ میں ہوئی۔ عبدالملک کے ساتھ زہری کی جان پہچان ابن زبیرؓ کے قتل کے چند سال بعد ہوئی۔

۵-حدیث نبوی ''لا تشد الرحال '' سب کتب حدیث میں موجود ہے، یہ زہری کے علاوہ دیگر متعدد طرق سے منقول ہے۔ امام بخاری نے حدیث کو ابوسعید خدری سے روایت کی ہے۔ اس سند میں زہری کا نام نہیں ہے۔ امام مسلم نے اس کو تین مختلف طرق واسانید سے روایت کیا ہے، ایک سند میں امام زہری ہیں۔ دوسری دوسندوں میں سے ایک بطریق جریر از ابن عمیر از ابوسعید خدریؓ منقول ہے اور دوسری ابو ہریرہؓ سے۔ ان دونوں سندوں میں امام زہری شامل نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ زہری اس حدیث کی نقل وروایت میں منفرد نہیں ہیں جیسا کہ گولڈزیہر نے دعویٰ کیا ہے بخلاف ازیں امام زہری کے ساتھ دوسرے راوی بھی شامل ہیں۔

۶- یہ حدیث امام زہری نے اپنے شیخ سعید بن المسیب سے روایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زہری نے یہ حدیث بنی امیہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے وضع کر کے سعید المسیب کی جانب منسوب کی ہوتی تو سعید ہرگز خاموش رہنے والے نہ تھے۔ حالاں کہ سعید بنی امیہ کے ستم رسیدہ تھے اور ان کو مارا پیٹا بھی گیا تھا۔ سعید بن المسیب نے ۹۳ھ میں ابن زبیر کے قتل کے ۲۰ سال بعد وفات پائی۔ حیرت ہے کہ سعید اس قدر طویل عرصہ تک کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ باوجودیکہ سعید حق وصداقت کے ایک کوہ گراں تھے اور کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کیا کرتے تھے۔

۷- اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ زہری نے یہ حدیث عبدالملک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کی تھی تو اس میں قبۃ الصخرۃ کی فضیلت کیوں نہ بیان کی، جس کے حج کی طرف عبدالملک لوگوں کو راغب کرنا چاہتے تھے۔ مذکورہ حدیث اور اس ضمن میں وارد شدہ دیگر احادیث صحیحہ میں صرف بیت المقدس میں نماز ادا کرنے اور اس کی زیارت کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کے لیے کوئی وقت متعین نہیں کیا گیا۔ یہ چیز اجمالاً قرآن نے بھی بیان کیا ہے۔ پھر اس سے عبدالملک کا مقصد کیوں کر پورا ہوسکتا ہے جو ایام حج میں لوگوں کو اس امر کی ترغیب دلانا چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کے بجائے صخرہ کا حج کیا کریں۔

۸- حدیث لاتشد الرحال کو علماء نے صحیح قرار دیا ہے۔ بیت المقدس اور صخرہ کے فضائل کے بارے میں وارد شدہ احادیث موضوعہ کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ احادیث زہری سے منقول بھی نہیں ہیں۔ علماء نے ان پر شدید جرح کی اور کہا کہ صخرہ سے متعلق تمام احادیث جھوٹی ہیں۔ علماء کا قول ہے بیت المقدس کی فضیلت کے بارے میں صرف مندرجہ ذیل تین احادیث صحیح ہیں:

(۱) حدیث ''لاتشد الرحال''

(۲) وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ زمین پر سب سے پہلے کوئی خانہ کعبہ تعمیر کیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا مسجد حرام، پوچھا اس کے بعد آپ نے فرمایا مسجد اقصیٰ۔

(۳) وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز سات سو نماز کے برابر ہے۔

اعتراض۳: ابراہیم بن ولید اموی کا واقعہ: یہودی مستشرق گولڈزیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ ولید بن ابراہیم اموی زہری کے پاس ایک رسالہ لایا اور کہا ''اس رسالہ میں احادیث مندرج ہیں آپ مجھے ان کی نقل و روایت کی اس حیثیت سے اجازت دیں کہ یہ میں نے آپ سے سنی ہے، زہری نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اجازت دے دی اور کہا ''میرے سوا اور کون آپ کو یہ حدیثیں سنا سکتا ہے؟ چنانچہ ولید بن ابراہیم ان احادیث کو زہری کی مرویات کی حیثیت سے روایت کرتا رہا۔

گولڈزیہر نے اس بیان میں مختلف طرح سے مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ محدث ابن عساکر نے تصریح کی ہے کہ ابراہیم کا سماع زہری سے ثابت ہے۔ غالباً واقعہ یوں ہوا کہ ابراہیم نے ایک تحریر استاد کے سامنے پیش کی۔ قبل ازیں ابراہیم نے ان سے وہ احادیث سن چکا تھا تو اس کو پڑھنے کے بعد

انھوں نے اجازت دے دی۔ یہ معاملہ جو ابراہیم کے ساتھ ہوا یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اور بہت سے لوگوں کی کتاب اور تحریر پڑھ کر امام زہری نے روایت کرنے کی اجازت دی۔ مثلاً ایوب کہتے ہیں: ہم اپنی معلومات زہری کے سامنے پیش کیا کرتے تھے اور دوسرے عبید اللہ بن عمر کا قول ہے: میں زہری کے پاس ایک کتاب لایا نہایت غور سے دیکھ کر کہا میں نے تجھے اس کے روایت کرنے کی اجازت دی۔

امام زہری کے اکثر تلامذہ کا یہ بیان ہے کہ وہ ان سے حدیثیں سن کر بعد ازاں ان کو سنایا کرتے اور وہ غور سے سن کر ان کی تائید کیا کرتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زہری کا قول ہے: ''تجھے کون اس کی اجازت دے سکتا ہے؟ بقول ابن عساکر دراصل یوں ہے کہ ''میرے سوا کون تجھے اس کی اجازت دے سکتا ہے۔'' یہ بات بالکل درست بھی ہے اس لیے کہ دوسرا کوئی شخص زہری کے تلامذہ کو وہ احادیث روایت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جو انھوں نے اپنے شیخ کے سوا اور کسی سے نہیں سنیں اور ائمہ حدیث کا یہ کہنا ہے کہ اگر زہری نہ ہوتے تو بہت سی حدیثیں ضائع ہو جاتیں۔ امام مسلم نے لکھا زہری ۹۰ ایسی احادیث روایت کرتے تھے جو اور کسی کو یاد نہ تھیں۔ لہٰذا زہری نے ابراہیم کو جو بات کہی تھی کہ میرے سوا اور کون شخص ان حدیثوں سے آگاہ ہے جو تجھے ان کی روایت کرنے کی اجازت دے گا، اس کا معنی یہ ہرگز نہیں کہ میرے سوا ان کو وضع کرنے کی جرأت اور کون کر سکتا ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ کتب حدیث میں ابراہیم کی کوئی روایت مذکور نہیں۔ کتب جرح و تعدیل میں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا، نہ اس کو ثقہ راویوں میں شمار کیا گیا ہے اور نہ ضعیف و متروک رواۃ و رجال میں، زہری کی اجازت سے ابراہیم کی روایت کردہ حدیث آخر گئی کہاں؟

اعتراض ۴: امام زہری کا قول کہ ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے کہ زہری نے خود اعتراف کیا تھا کہ ''امراء نے ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری اپنی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت وقت کی خواہشات کی تکمیل کیا کرتے تھے۔''

امام زہری بہت صداقت پسند اور جرأت مند آدمی تھے۔ وہ حکام کی خواہشات کا احترام کرنے والے نہ تھے۔ زہری اور اموی خلفاء کے درمیان جو واقعات ہوئے یہ زندہ دلیل ہے کہ امام زہری کا دامن آلائشوں سے پاک تھا۔

گولڈ زیہر نے جو عبارت نقل کی ہے وہ ایسی تحریف پر مشتمل ہے، جس سے معنی و مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔ ابن عساکر اور ابن سعد کے مطابق اصل عبارت یوں تھی کہ زہری لوگوں کو حدیثیں لکھنے سے منع کیا کرتے تھے تاکہ وہ کتابوں کے بجائے اپنی قوت حافظہ پر بھروسہ کریں۔ جب ہشام نے باصرار زہری سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کے لڑکے کو حدیثیں لکھوائیں۔ زہری نے چار صد احادیث املاء کروا دیں۔ اور بلند آواز سے یہ بات کہتے ہوئے بارگاہ خلافت سے چل دیتے کہ ''لوگو! ہم تمہیں ایک بات سے منع کیا کرتے تھے اب وہی کام ہمیں ان لوگوں کے لیے کرنا پڑا۔ امراء نے ہمیں کتابت حدیث پر مجبور کر دیا ہے اب آؤ میں تمھیں حدیثیں سناؤں اس کے بعد چار صد احادیث لوگوں کو سنا دیں۔

گولڈ زیہر نے زہری کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اور مورخین کے نقل کردہ الفاظ میں کس قدر بُعد تفاوت پایا جاتا ہے۔

گولڈ زیہر نے ''کتابتِ احادیث'' کا لفظ نقل کیا ہے اور بخلاف ازیں مورخین نے ''کتابۃ الاحادیث'' اور خطیب نے ''کتاب العلم'' لکھا ہے۔ اب گولڈ زیہر کی علمی امانت دیکھئے کہ ''الاحادیث'' سے ال حذف کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو بات زہری کی فضیلت پر مشتمل تھی وہ رذیلت ہو کر رہ گئی۔ اصلی عبارت سے زہری کی امانت و دیانت ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی زہری کو یہ بات ناپسند تھی کہ امراء کے سامنے علم کی اشاعت کریں اور لوگوں سے اسے چھپائے رکھیں۔ یہودی مستشرق کی علمی امانت کا اندازہ لگائیے۔ وہ زہری کی جانب اس بات کو منسوب کرتا ہے کہ امراء نے ان کو حدیثیں وضع کرنے پر مجبور کیا تھا۔ دونوں عبارتوں میں بیّن تفاوت پایا جاتا ہے۔

فقہ کے باب میں اہم مستشرقین کا تعارف

محمد عاطف شاداب

فقہ کی تعریف

فقہ کے لغوی معنی فہم اور سمجھ کے ہیں اور اس کے ایک اور معنی ہیں باریک بینی یعنی کلام کے غرض اور مقاصد کو سمجھنا۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف

جس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے اور جواب تک باقی ہے، وہ یہ ہے **العلم بالاحکام الشرعیة الفرعیة العلمیة المستمدة من الادلة التفصیلة.**

یعنی تفصیلی دلائل سے مستنبط کیے گئے شرعی وفرعی عملی احکام کا جاننا۔ شرعی احکام سے مراد وہ احکام ہیں۔ جن کا تعلق اعتقاد سے ہو، یعنی بندوں کے افعال کے متعلق اللہ کے خطاب کو شرعی کہتے ہیں، جس میں کسی فعل کو کرنے کی طلب یا شرط موجود ہو۔ فرعی وہ احکام ہیں جن کا تعلق اعضاء وجوارح سے ہو۔ ادلہ تفصیلیہ سے مراد قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہے۔

فقہ کے بنیادی ماخذ

اسلامی فقہ کے بنیادی ماخذ چار ہیں۔ ان میں دو ماخذ اہم ترین ہیں: (۱) قرآن (۲) سنت۔

قرآن

سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے اور یہی اصل الاصول ہے، اس سے زندگی کے ہر شعبے میں رہ نمائی ملتی ہے۔ اور یہ دنیا وآخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے اور یہ اللہ کی آخری کتاب ہے، جو تقریباً تئیس سال کی مدت میں نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوئی۔

سنت

کتاب اللہ کے بعد دوسرا اہم ترین ماخذ سنت رسولؐ ہے۔ آپ کے افعال واقوال وارشادات اور ہر ایسا معاملہ جو نبی کریمؐ کے سامنے پیش آیا اور آپ نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی اس کو سنت کہتے ہیں۔ سنت کے ذریعہ قرآن مجید کی تشریح ہوتی ہے۔ سنت کے بغیر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی تفصیل نہیں سمجھی جاسکتی اور اس میں بعض ایسے احکام ہیں جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے مثلاً: **فاقطعوا ایدیھما** میں اید کی تعیین حدیث سے کی گئی ہے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

> **ترکت فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلو بعدی کتاب اللہ و سنتی.** (موطا امام مالک)
>
> ''میں تمہارے درمیان ایسی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اگر تم اس کو پکڑے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت ہے۔''

حضرت معاذ بن جبل کو رسولؐ نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا اور ان سے کہا کہ تم مسائل کا تصفیہ کس طرح کروگے تو انھوں نے جواب دیا: پہلے قرآن میں تلاش کروں گا اس کے بعد سنت میں اس لیے تمام لوگوں کو اس سے مسائل اخذ کرنے چاہیے۔

فقہ پراعتراض کرنے والے اہم مستشرقین

قرآن وحدیث، سیرت وتاریخ کے علاوہ مستشرقین نے فقہ کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ شروع میں بعض لوگوں نے فقہی کتب کے عربی سے انگریزی میں ترجمے کیے۔ جب کہ بعد از اں اسلامی قانون کے بارے میں مستشرقین نے اپنے نقطہ ہائے نظر بیان کرنا شروع کردیے، بلاشبہ مغرب میں موجودہ قانون اور صورتوں کا ماخذ رومی قانون ہے، جب کہ مشرق میں اسلامی قانون کو ایک بنیادی مصدر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ اسلام کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ اور طرح طرح کے شکوک وشبہات کی بنیاد پر اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی قانون بھی رومی قانون سے ماخوذ ہے۔ فقہ اسلامی پر اعتراض کرنے والے مستشرقین درج ذیل ہیں:

ڈینکن میکڈونلڈ

فقہ پر اعتراض کرنے والا یہ پہلا مستشرق ہے۔ یہ ۱۸۶۳ میں پیدا ہوا۔ یہ ایک امریکی مستشرق اور پروٹسٹنٹ عیسائی تھا۔ اس نے ساری زبان کی تعلیم گلاسکو اور برلن یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کی دلچسپی مسلم الٰہیت سے تھی جس کی وجہ سے اس کی توجہ الف لیلہ ولیلہ کی طرف ہوئی اور اس نے اس کو ایڈٹ کر کے شائع کر دیا۔ اس نے مسلم عیسائیت کے تعلق سے بہت کچھ لکھا ہے اور اس نے مشرق وسطیٰ میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ایک پروٹسٹنٹ مشنری بھی بھیجی۔ اس کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

فقہ کے حوالے سے اس کی کتاب Devlopment of Muslims Theology jurisprevelence and constitution theory ہے، جو ۱۹۰۳ میں شائع ہوئی، اس نے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں ۱۹۱۱ کے ایڈیشن میں امام ابوحنیفہ، امام احمد، بخاری، قاضی، مفتی اور دیوان وغیرہ پر مقالے لکھے۔ داکٹر عجیل نے اپنی کتاب ''المستشرقون ومصادر التشریع'' میں اس کے افکار پر تنقید کی ہے۔

گاٹ ہیف بیگش ٹریسا

یہ ایک جرمن مستشرق اور پروٹسٹنٹ عیسائی ہے۔ یہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوا۔ اور سامی زبان کے ایک ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ جرمن کی طرف سے ترکی میں بطور آفیسر کام کرتا تھا۔ اس دوران قسطنطنیہ یونیورسٹی میں وہ ایک پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ ترکی کے قیام کے دوران اس نے شام اور فلسطین کے سفر کے دوران آرامی عربی زبان سیکھی۔ وہ علی الاعلان نازی ازم کا مخالف تھا اور اس نے یہودی جرمن اسکالر کی حفاظت کے لیے کافی اقدامات کیے ہیں۔

فقہ اسلامی کی تاریخ پر اس کی دو اعتبار سے تحقیقات ہیں جنہیں اس کے شاگرد جوزف نے آگے بڑھایا۔ اس نے پہلے میں فقہی فکر کی خصوصیات کا تعارف کر دیا ہے اور دوسرے میں فقہ اسلامی میں تحقیق کے مناہج پر بحث کی ہے۔ یہ بحث جرمن تحقیقی مجلّے Der Islam میں ۱۹۲۵ اور ۱۹۳۱ میں شائع ہوئی۔ اس کا انتقال ۱۹۳۳ میں ہوا۔

جوزف شاخت

یہ ایک برطانوی مستشرق تھا۔ اسے فقہ اسلامی کا اہل مغرب میں ماہر ترین اسکالر سمجھا جاتا تھا۔ وہ

۱۹۰۲ میں ایک کیتھولک فیملی میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم جرمن میں حاصل کی۔ شاخت بیکش ٹریسا کا شاگرد تھا۔ ۱۹۳۲ میں یونیورسٹی آف کونس بیگ میں پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۳۴ میں نازی ازم سے اختلاف کی وجہ سے قاہرہ آ گیا۔ اور یہاں ۱۹۳۹ تک تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۶ میں آکسفورڈ یونیورسٹی جوائن کی۔ اس کے بعد یونیورسٹی آف لائیڈن انگلینڈ سے وابستگی اختیار کی۔

۱۹۵۷ میں کولمبیائی یونیورسٹی میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اور یہاں ہی ۱۹۵۹ میں علوم اسلامی اور عربی زبان میں پروفیسر مقرر رہا۔ ۱۹۶۹ میں انتقال ہوا۔ فقہ پر اس کی کتاب Origins of Mohammadan آج بھی مغرب میں ایک مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۵۰ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی اور اسی موضوع پر ایک اور کتاب: An Introduction of Islamic law بھی ۱۹۶۴ میں شائع ہوئی۔ فقہ اسلامی کے بارے میں شاخت کا نقطۂ نظر اتنا مقبول ہوا کہ مستشرقین کی ایک بڑی جماعت نے ان کو سراہا ہے۔

کیونس کا کہنا ہے کہ شاخت نے اس کام کے ذریعے اسلامی قانون کے بارے میں ایک ایسی تحقیق پیش کر دی ہے، جس کو چیلنج کرنا ناممکن ہے۔

ہالٹن گپ کا کہنا ہے کہ شاخت کا یہ کام کم از کم مغرب میں اسلامی قانون اور تہذیب میں کسی بھی قسم کی مزید تحقیق کے لیے ایک مصدر بن گیا ہے۔

شاخت کا نقطۂ نظر سے مستشرقین اس طرح متعصب ہو گئے تھے کہ جب امین المصری المرحوم نے یونیورسٹی آف لندن میں پی ایچ ڈی مقالے کے لیے شاخت کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لینے کا موضوع پیش کیا تو اسے نامنظور کر دیا گیا کہ شاخت کی تحقیق ناقابل تنقید ہے، اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پیغمبر اسلام کا نہ تو کوئی نیا قانونی نظام وضع کرنے کا پروگرام تھا اور نہ ہی دین اسلام میں ان کی کوئی قانونی حیثیت تھی اور نہ ہی وہ منبع قدرت تھے۔ (بحوالہ: An introcuction of Islamic Law) اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ قدیم فقہی مذاہب یعنی اہل الرائے وغیرہ نے ایک ایسی حزب اختلاف پیدا کر دی جنھوں نے اپنا فقہی موقف ثابت کرنے کے لیے پیغمبر اسلام کے بارے میں بہت سی غلط تفصیلات جمع کر دیں تا کہ وہ اپنا نقطہ نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے منوا سکیں۔ اور کوئی بھی قانونی یا فقہی حدیث ایسی نہیں ہے جو پیغمبر اسلام سے مروی ہو بلکہ مسلمان علماء نے ہزاروں فقہی احادیث پر مشتمل ذخیرہ وضع

کر کے ایک عظیم اسلامی قانون کی بنیاد رکھی اوران کی اسنادخودبخودگھڑھ لی۔

نورمن کولڈر

نورمن کولڈر۱۹۵۰میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔اس نے امریکن مستشرق جان وانس بارا کی سرپرستی میں یونیورسٹی آف لندن سے پی ایچ ڈی مکمل کی۔اس کے پی ایچ ڈی کے مقالے کاعنوان: The structure of the Autority in jurisp and redence تھا۔ ۱۹۸۰ میں یونیورسٹی آف مانچسٹر کےتحت مطالعہ مشرق وسطیٰ "Middle Eastern studies" کے ڈپاٹمنٹ کوجوائن کیا۔۱۹۹۸ء میں جب کہ وہ اسی یونیورسٹی میں ایک سینئرلکچرر کےطور پر کام کرر ہا تھا اس کی وفات ہوگئی۔اس کی کتابوں میں:

Islamic اور Studies in early muslim jurisprudence Classical Era اور Jurisprudence in the interpretation and jurisprudence in medieval islam شامل ہیں۔پہلی کتاب میں اس نے فقہ اسلامی کے مصادراور تدوین پر بحث کی ہےاوراسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے۱۹۹۳میں ائع کیا ہے۔دوسری کتاب نورمن کے چار مضامین پر مشتمل ہے،جنہیں اس کی وفات کے بعدکولن امبانے۲۰۱۴میں ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔یہ مضامین دسویں سے چودھویں صدی عیسوی کے مابین تیار ہونے والے فقہی لٹریچر کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔تیسری کتاب اس کے۲۱ مضامین پر مشتمل ہے جنھیں اس کی وفات کے بعد جاویدمجددی اوراینڈر ریورپین نے ایڈٹ کر کے۲۰۰۶میں شائع کیا۔

●○●

استشراق کے رد میں نمایاں خدمات

معروف علماء اور تصانیف کے حوالے سے

محمد معاذ

مستشرقین کے منفی تنقید کے ردِعمل میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے دین اسلام کا دفاع کیا اور مستشرقین کے زہریلے نقد کے جواب میں مستقل کتابیں لکھی اور اسلام کے دفاع میں ان سے مناظرے کیے، مقالے اور رسالے لکھے۔ ان علمائے کرام کی نمایاں خدمات درج ذیل ہیں۔

سرسید احمد خان

سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) انیسوی صدی کے ایک ہندوستانی عالم مسلم اور بے نظیر عملیت کے حامل اور فلسفی تھے۔ سرسید احمد خان ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے مغل دربار کے ساتھ مضبوط تعلقات تھے۔ مستشرقین کے حوالے سے بھی مطالعہ وسیرت کا علمی محاذ سب سے پہلے دراصل سرسید احمد ہی نے کھولا۔ سرسید نے جذبۂ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ کے ساتھ کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم میور کی دل آزار تصنیف The life of Muhammad کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا اور تمام تر کم مائیگی کے باوجود خالص علمی سطح پر کتاب پر تنقید ومحکمہ کر کے تاریخی حقائق اور اسناد پر مبنی ایک جواب کتاب ''الخطبات الاحمدیہ علی للعرب والسیرۃ النبویہ'' لکھی۔ اس کتاب کی تصنیف کے لیے سرسید احمد نے ۱۸۶۹ء میں انگلستان تک کا سفر کیا۔ مولانا نے اپنی کتاب میں جوابات دیے ہیں ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سلسلے میں ان کی کوششیں خشت اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں مستشرقین کے بہت سے اعتراضات کا جواب دیا ہے چاہے وہ تعدادِ ازدواج کا مسئلہ ہو یا اسلام میں آزادی پر جو اعتراض کیے گئے ہیں ان کا، انھوں نے اپنی اس کتاب میں مکمل اور مدلل انداز میں جواب دیا ہے۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی پیدائش اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں بندول میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مولوی فاروق چریا کوٹ سے حاصل کی۔ ۱۸۱۷ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے، ۱۸۹۲ء میں روم اور شام کا سفر کیا اور ۱۹۱۲ء میں دار المصنّفین کی بنیاد ڈالی۔

تاہم جو شہرت عام اور بقائے دوام علامہ شبلی نعمانی کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ مولانا کی شہرۂ آفاق کتاب سیرت النبیؐ صرف سیرت ہی کی کتاب نہیں بلکہ اس میں مستشرقین کے اعتراضات کا کافی علمی جواب بھی ہے۔ جب سیرت النبیؐ کا بنیادی خاکہ تیار کیا گیا تھا تو اس کے پانچ حصے کیے گئے۔ پانچویں حصے کے بارے میں خود مولانا لکھتے ہیں کہ پانچواں حصہ خالص یورپین تصنیفات سے وابستہ ہے یعنی یورپ نے آں حضرتؐ اور مذہب اسلام سے متعلق کیا لکھا ہے اور ان کا سرمایہ معلومات کیا ہے اور حضور ﷺ کے اخلاق وعادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں ہوئی ہیں ان کا انھوں نے اس پانچویں جلد میں جواب دیا ہے۔ (۲)

اس کے علاوہ ان کے قائم کردہ دار المصنّفین کے رفقاء نے مولانا شبلی کے وہ مضامین جس میں انھوں نے اسلام اور شارع علیہ السلام و تاریخ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کا جو جواب دیا ہے مختلف سیمیناروں کے ذریعے اس کو ایک کتابی شکل میں جمع کیا ہے اور اس کتاب کو ''اسلام اور مستشرقین'' کے نام سے سات جلدوں میں شائع کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۸۵۳) اردو کے نامور سیرت نگار عالم مورخ اور چند قابل قدر کتاب کے مصنف تھے جس میں سیرت النبی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان کا شمار علامہ شبلی نعمانیؒ کے سب سے لائق شاگردوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے علامہ کی وفات کے بعد سیرت النبیؐ کی بقیہ جلدیں لکھیں اور اپنے استاد کے ادھورے رہ جانے والا کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مستشرقین کے حوالے سے سید سلیمان ندوی کا درجہ نہایت صائب معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف مستشرقین کے حوالے سے مستشرقین کے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں تو ساتھ ہی اسلام کے سیرت کے حوالے سے ان کے

عزائم کو خوب پہنچاتے ہیں۔سید سلیمان ندوی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ارض القرآن ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے۔اس کتاب میں انھوں نے قرآنی عہد انبیاء کے ظہور اور ان کے سرگرمیوں کے مراکز کا تاریخی اور جغرافیائی جائزہ لیا ہے تاکہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکار ہو جائے۔(۳)

رحمت اللہ کیرانوی

رحمت اللہ کیرانوی (۱۲۳۳-۱۳۰۸) کا پورا نام رحمت اللہ بن خلیل تھا۔آپ خلیل الرحمٰن کے نام سے جانے تھے۔آپ نے ایک مشہور پادری فنڈر سے ایک مشہور ومعروف مناظرہ کیا تھا۔ پادری صاحب نے اپنی کتاب میزان الحق کو لکھ کر سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں میں اس کے جواب کی طاقت نہیں، مناظرہ کا اختتام اس طرح ہوا کہ پادری صاحب نے انجیل کے آٹھ مقامات پر تحریف ہونے کا اعتراف کرلیا تھا۔یہ مناظرہ تین دن تک جاری تھا اور تیسرے دن پادری صاحب مناظرہ آدھا چھوڑ کر بھاگ گئے۔اس عرصے میں مولانا نے ایک معرکہ آرا کتاب اظہار الحق تصنیف کی۔انھوں نے اپنی اس کتاب میں تورات وانجیل میں جو تحریف ہے، اس پر خلاصہ بحث پیش کیا اور عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث کو باطل قرار دیا ہے اور قرآن کے تئیں مستشرقین کے جو اعتراضات تھے اس کا انھوں نے دندان شکن جواب دیا ہے۔یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اس کا ترجمہ مولانا تقی عثمانی صاحب نے 'بائبل سے قرآن تک' کے نام سے کیا ہے۔

مولانا تقی عثمانی

مولانا تقی عثمانی (پ۱۹۴۳) عالم اسلام کے مشہور عالم اور جید فقیہ ہیں۔آپ کا شمار عالم اسلام کے بیسویں صدی کے چوٹی کی علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔۱۹۸۰ سے۱۹۸۲ تک وفاقی شرعی عدالت اور۱۹۸۲ سے۲۰۰۲ تک عدالت عظمی پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے جج رہ چکے ہیں۔انھوں نے علوم القرآن کے نام سے ایک زبردست کتاب لکھی ہے۔انھوں نے اپنی اس کتاب میں قرآن کی حفاظت کے تئیں مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں ان کا انھوں نے جواب دیا ہے۔انھوں نے اس کتاب میں مارگولیتھ جو صحیحین کی ایک حدیث کی بنیاد پر قرآن کریم کو مشکوک بنانے کی جو کوشش کی ہے

اس کا رد کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک صحابی کو مسجد میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا:

رحمه الله لقد اذكرني آية كنت انسيتها

''اللہ ان پر رحم کرے انھوں نے مجھے ایک ایسی آیت یاد دلائی جو مجھ سے بھول گئی تھی۔''

اس روایت کو پیش کرنے کا مقصد مارگولیتھ کی نظر میں یہ بتلانا ہے کہ معاذ اللہ اللہ کے رسول ﷺ ایک ایک آیت کو کیسے بھول سکتے ہیں۔

اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ یہ اعتراض اس قدر بے بنیاد ہے کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسے درست تسلیم نہیں کرسکتا کیوں کہ مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بسا اوقات ایک بات انسان کو یاد تو ہوتی ہے مگر چوں کہ عرصہ دراز تک اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا نہ اس کی طرف کوئی خیال جاتا ہے وہ ذہن سے نکل جاتی ہے اور جب کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ فوراً حافظہ میں تازہ ہو جاتی ہے۔ یہی صورت آں حضرت ﷺ کو پیش آئی اس لیے ایسے واقعے کو بنیاد بنا کر آں حضرتؐ کی طرف نسبت کرنا انتہا درجے کی بے انصافی ہے۔ (۴)

شیخ مصطفیٰ السباعی

شیخ مصطفیٰ السباعیؒ (۱۹۱۵-۱۹۶۴) شام میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش اس وقت ہوئی جب دنیا پہلی جنگ عظیم کی ہولنا کیوں میں تھی۔ آپ کا تعلق آل سباعی سے تھا جو حمص کا ایک معروف اور کثیر الافراد خاندان تھا۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم جامعۃ الازہر قاہرہ سے حاصل کی، جامعہ الازہر کے شعبہ اسلامی الٰہیات سے انھوں نے **السنة و مكانتها في التشريع الاسلامی** The Sunah its usle in islamic legislation کے موضوع پر ڈاکٹریٹ مکامل کی آپ کو تحریک اخوان المسلمین سے بے حد لگاؤ تھا۔

آپ کا یہ مقالہ سات فصلوں پر مشتمل ہے۔ شیخ نے اپنی اس کتاب میں السنۃ مع المستشر قین کے نام سے ایک باب باندھا ہے جس میں انھوں نے گولڈ زیہر اور دوسرے دیگر مستشرقین کا حدیث کے تئیں جو اعتراضات تھے اس کا رد کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس مقالے میں لکھتے ہیں کہ گولڈ زیہر جس نے

اپنے زعم فاسد سے احادیث نبویہ کی پہلی تین صدیوں کی کارکردگی کو بے نتیجہ قرار دیا ہے اور اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے علامہ الدمیری کی کتاب حیاۃ الحیوان سے حوالہ دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ کتاب حدیث کی کتاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو ثانوی درجے کی کتاب بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی اپنے اس مقالے میں دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ حدیث نبوی کو نا قابل اعتبار ٹھہرانا مستشرقین کا خصوصی ہدف رہا ہے وہ جانتے تھے کہ حضور نبی ﷺ قرآن حکیم کی تفسیر اور وضاحت جب قرآن حکیم کو وضاحت نبوی سے الگ کردیا جائے، تو اس طرح وہ مسلمان کو ان کے اصل دین سے دور کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔(۵)

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی (۱۹۳۰-۲۰۱۷ء) ایک ممتاز بھارتی نژاد سعودی محدث تھے۔ ۱۹۸۰ میں فن حدیث میں ممتاز خدمات کی بنا پر عالمی شاہ فیصل اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۵۵ میں دارالعلوم دیوبند سے عالمیت کی تکمیل کے بعد جامعہ ازہر میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ایم اے مکمل کرنے کے بعد ۱۹۶۶ میں کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مصطفیٰ اعظمی گولڈزیہر، ڈیوڈ مارگولیتھ اور جوزف شاخت کے نظریات پر تحقیقی تنقید کے لیے مشہور تھے۔ ایک کتاب مستشرقین کے رد میں **دراسات فی حدیث النبویه** کے نام سے انھوں نے لکھا جو کہ انگریزی زبان میں تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے قدیم وجدید قسم کے انکار حدیث اور مختلف گروہوں کی حدیث کے متعلق رائے اور منکرین حدیث کے دلائل اور ان کا رد پیش کیا ہے اور مستشرقین نے جو اسانید اور متون پر اعتراضات کیے ہیں ان کا سرسری جائزہ لیا اور اس کے متعلق شبہات کا ازالہ بھی کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ آخری بار جامعۃ الریاض سعودیہ سے شائع ہوا۔ نیز انھوں نے اس مقالے میں اسناد کے تعلق سے پروفیسر شاخت کے جو اعتراضات ہیں ان کو نقل کرنے کے بعد بہت ہی مدلل انداز میں اس کا رد کیا ہے۔(۶)

فواد سزگین

فواد سزگین (۱۹۲۴-۲۰۱۸) کی پیدائش تبلیس میں ہوئی اور استنبول میں ان کی وفات ہوئی۔ یہ ایک جرمن محقق تھے، جن کا خصوصی موضوع عہد وسطیٰ میں علوم اسلامی رہا ہے۔ ان کا سب سے بڑا تجربہ

یہ ہے کہ ایک جرمن مستشرق Heltned Ritler کے شاگرد ہیں۔ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ پر ایک کتاب ''تاریخ التراث العربی'' لکھی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔انھوں نے اپنی اس کتاب میں علوم تاریخ،تاریخ طب،علم کیمیا،ریاضیات کی تاریخ اور فلکیات کے تاریخی پہلو کے تئیں مسلمان عربوں کا جو مستشرقین نے غلط تصور پیش کیا ہے اس کا انھوں نے اپنی کتاب میں رد کیا ہے اور اس کا صحیح تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔(۷)

اس کے علاوہ مستشرقین نے دیگر اسلامی علوم پر بھی کافی اعتراضات کیے ہیں اور ان کے اندر لوگوں کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے،جس کے رد میں مسلمان علماء نے اپنی خدمات اور کارنامے انجام دیے ہیں جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آخر میں اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمیں ان استشراقی فریب سے بچائے اور ہمیں مزید علم دے تاکہ ہم ان مستشرقین کے تعلق سے جو انھوں نے سیرت اور قرآن اور حدیث کی حجیت اور تاریخ اسلام کے تئیں جو اعتراضات کیے ہیں ہم ان کے اعتراضات کا جواب دے سکیں اور ان کی کتابوں پر تنقید کر سکیں۔

مراجع ومصادر

۱۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن،اسلام اور مستشرقین،جلد سوم،ص ۳۱۷،

۲۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول،ص ۸۶

۳۔ ارض القرآن،ص ۷،سید سلیمان ندوی

۴۔ علوم القرآن،ص ۳۱۵،مولانا تقی عثمانی

۵۔ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی،شیخ مصطفیٰ السباعی،ص ۱۴

۶۔ دراسات فی الحدیث النبویہ،ص ۴۴۲،ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی

۷۔ تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام،ص ۷

فقہِ اسلامی پر شاخت کے اعتراضات کا جائزہ

خباب شہزاد

پہلا اعتراض

جوزف شاخت نے اپنے ایک مقالے میں متعدد مقامات پر لفظ ''زکا'' زکوٰۃ اور صدقہ کی لغوی تحقیق کی ہے اور اس سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ زکوٰۃ کا دراصل یہود کہ ایک مذہبی تعبیر سے ماخوذ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مسلم علماء عربی زبان کے لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت اور اضافہ بتاتے ہیں۔ عبرانی زبان میں ایک لفظ ''زکوت'' ہے اسی لفظ کو جناب محمدؐ نے اور زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اس کے معنی بھی طہارت اور پاکی کے ہیں۔''

۱۹۶۱ء میں شاخت کا یہ مقالہ اضافہ و ترمیم کے بعد شائع ہوا اس میں انھوں نے اپنے مذکورہ بالا خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''علم صرف اور اشتقاق کی رو سے لفظ ''زکوٰۃ'' کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔ اب یہ عربی مفردات میں شمار ہونے لگا ہے۔ اسے رسولؐ نے یہودیوں میں رائج آرامی لفظ ''زکوت'' سے اخذ کیا تھا بعد میں وہ عربی زبان میں استعمال ہونے لگا۔ شاخت کا یہ کہنا کہ زکوت کے معنی طہارت اور پاکیزگی کے ہیں صحیح ہے لیکن عربی زبان کے لفظ زکوٰۃ کے بارے میں ان کے خیالات صحیح نہیں ہیں بلکہ گمراہ کن ہیں۔''

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ عبرانی آرامی عربی اور بائبل سامی الاصل زبانیں ہیں اس حیثیت سے ان کے درمیان بعض لفظوں کا اشتراک ممکن ہی نہیں متوقع اور قرین قیاس ہے لیکن قطعی طور سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اصلاً کس زبان کے الفاظ ہیں اور مذہبی تاریخی طور

پر یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کب اور کیسے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے۔ شاخت کا یہ کہنا کہ لفظ زکوٰۃ عبرانی یا ارامی زبانوں سے ماخوذ ہے یہ ان کا ایک فرضی خیال ہے اور ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں، شاخت کے مطابق کیا کسی زبان میں ایک کلمہ یا لفظ کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ابتدا سے اس زبان کا لفظ ہے یہ صحیح ہے کہ عربی زبان کی تالیف وتدوین عہد رسالت سے شروع ہوئی لیکن اس کی سیکڑوں برس کی قدیم تاریخ واقعات قصص اور اشعار وخطبات میں محفوظ رہی۔

اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ لفظ زکوٰۃ عبرانی یا آرامی سے عربی میں منتقل ہوا ہے تب بھی یہ ماننا ہوگا کہ یہ لفظ اسلام سے پہلے عربی زبان میں داخل ہو چکا تھا۔ اس صورت میں دعویٰ کہ محمدؐ نے پہلی بار اس لفظ کو یہودیوں سے لیا ہے کیا صحیح ہوسکتا ہے؟

پھر عبرانی اور آرامی میں زکوت کے معنی صرف پاکی، براءت حق اور برائی کے ہیں ان تمام معانی میں کسی ایک سے بھی دینی فریضہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا جب کہ اسلام میں لفظ زکوٰۃ سے ایک مکمل دینی فریضہ مراد لیا جاتا ہے جس کے اپنے اصول وضوابط ہیں۔

اس طرح شاخت کا یہ دعویٰ کہ لفظ زکوٰۃ کی علم تصریف واشتقاق میں کوئی بنیاد نہیں، صحیح نہیں ہے۔ اگر صرف ابن منظور کی لسان العرب ہی کو دیکھ لیا جائے تو اس بلند بانگ دعویٰ کی قلعی کھل جائے گی۔

ابن منظور لکھتے ہیں ''الزکاۃ'' زکا یزکو کا مصدر ہے اس کے معنی نمو، برکت، طہارت، صلاح اور تعریف کے ہیں۔ کہا جاتا ہے زکی نفسہ یعنی اس نے اپنے کو پاک قرار دیا۔

اسلام نے لفظ زکوٰۃ کو معروف اصطلاحی معنی کے علاوہ مذکورہ بالا تمام لغوی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے اور یہ تمام معانی عربی کے دیگر الفاظ کی طرح منطقی تدریج سے گزر کر اس صورت تک پہنچے یعنی زکوۃ کے حسی معنی (نمو) سے مجازی معنی برکت، طہارت، صلاح اور تعریف پیدا ہوئے پھر اسی سے زکوٰۃ کا یہ لفظ فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ یہ لفظ عربی زبان کے لیے نیا نہیں بلکہ نہایت قدیم ہے۔

دوسرا اعتراض

جوزف شاخت کا خیال ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کا مفہوم یہودیت سے لیا گیا ہے حالاں کہ ان مذاہب میں زکوٰۃ کے مفہوم کے تقابلی جائزہ سے شاخت کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ تینوں آسمانی

مذاہب (اسلام، نصرانیت اور یہودیت) میں فقراء اور معذور لوگوں کی مدد، ان کے ساتھ حسن سلوک اور صدقہ وخیرات کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ تورات وانجیل کے موجودہ نسخے بھی اس کی تائید کرتے ہیں البتہ صدقات وخیرات اور حسن معاملات کا نہ کوئی متعین نصاب رکھا گیا ہے اور نہ کوئی قطعی مقدار مقرر کی گئی ہے بلکہ افراد کی ایمانی حرارت، نیکی، تقویٰ اس کے پیمانے ہیں اس کے برخلاف کچھ صدقات ایسے ہیں جن کی ادائیگی لازمی ہے۔ یہ دو طرح کے ہیں (۱) اسلام میں زکاۃ (۲) دیگر مذاہب میں عشر، لیکن ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر صرف مذہبی سربرآوردہ شخصیتوں مثلاً: پوپ، پنڈت، پروہت اور ان کے خاندان کے افراد کے لیے یا بعض مذہبی روایات کی بجا آوری کے لیے وصول کیا جاتا رہا ہے گو اس کا کچھ حصہ مذہبی طبقہ کی طرف سے فقراء کو بھی دے دیا جاتا تھا مگر یہ لازمی نہ تھا اور نہ ہی اس کی مقدار متعین تھی جس پر عمل کیا جاتا رہا ہو۔ بعض مورخین کے بقول یورپ کے عہد وسطیٰ تک فقراء اور معذوروں کو صدقہ میں دی جانے والی یہ رقم انتہائی معمولی اور حقیر ہوتی تھی اس کے برعکس مذہبی طبقہ نہایت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے برخلاف اسلام میں زکوٰۃ کے اولین حق دار فقراء میں ہیں۔ زکوٰۃ وصدقات کی رقم دی جاسکتی ہے ورنہ نہیں۔ یہ مال مساجد کے لیے بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا جب کہ دیگر مذاہب میں عشر پر دینی طبقہ کا قبضہ وتصرف ہوتا ہے۔

شاخت نے اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر کے زکوۃ اور زکوت کی لفظی بحث چھیڑ دی ہے اور اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت، معاشرہ میں اس کے پاکیزہ اثرات اور اعلیٰ انسانی واخلاقی معنوں کے اقرار کے بجائے اس کو یہودیت سے ماخوذ دینے کی کوشش کی ہے اور اس طرح سے اسلام کی ایک امتیازی خوبی کا سہرا یہودی شریعت کے سر باندھنے کی سعی کی ہے۔ (۲)

تیسرا اعتراض

شاخت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا نہ تو کوئی نیا قانونی نظام وضع کرنے کا پروگرام تھا نہ ہی دین اسلام میں محمدؐ کے پاس کوئی قانونی حیثیت تھی اور نہ ہی وہ منبع قدرت تھے۔

شاخت کا یہ نکتہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو دین اسلام میں کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے یا ان کا مقصود امت مسلمہ کو کوئی قانونی نظام دینا نہیں ہے تو یہ قطعاً غلط مفروضہ ہے۔ قرآن اس کی شدومد سے مخالفت کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِم (الاعراف:۱۵۷)

اس آیت میں تحلیل وتحریم کی نسبت اللہ کے رسولؐ کی طرف کی گئی ہے۔ گویا جسے اللہ کے رسول نے حلال قرار دیا قرآن نے اسے حلال کیا ہے۔ اور جسے اللہ کے رسولؐ نے حرام قرار دیا قرآن نے اسے حرام کہا ہے۔ اس طرح اللہ کے رسولؐ کی یہ صفت بھی بیان ہوئی ہے کہ آپؐ لوگوں کی گردنوں میں پڑے ہوئے رسوم ورواج کے طوقوں سے انھیں آزادی دلاتے ہیں۔ کسی معاشرے کے رسوم ورواج بعض اوقات اس معاشرے میں قانون کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں جسے کامن لا کہا جاتا ہے تو اللہ کے رسولؐ نہ صرف تحلیل وتحریم کے بیان کے ذریعے امت مسلمہ کو اسلامی قانون دے رہے ہیں بلکہ اس جاہلی معاشرے میں پہلے سے موجود قوانین کو بھی باطل قرار دے رہے تھے۔

ایک اور جگہ قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب ہے:

قَاتِلُواْ الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّهُ وَرَسُولُه(التوبۃ:۲۹)

اس آیت میں بھی اللہ کے رسولؐ کی طرف سے حرام کردہ اشیاء کو دین اسلام نہ سمجھنا اتنا بڑا جرم قرار دیا گیا ہے کہ اس پر قتال کا حکم ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُون

(النحل:۴۴)

اس آیت میں اللہ کے رسول ﷺ کی یہ ذمے داری بیان کی گئی ہے کہ آپ اللہ کی کتاب کی وضاحت کریں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَطِيْعُواْ اللّهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِيْ الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيْلاً(النساء:۵۹)

اس آیت میں مسلمانوں کے باہمی اختلافات میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع سے مراد ہے قرآن کی طرف، جب کہ اللہ کے رسول کی طرف رجوع سے مراد ان کی ذات یا ان کے اس دنیا سے رخصت کے بعد ان کی سنت کی طرف رجوع ہے۔ اگر اللہ کے رسولؐ دین اسلام میں مصدر قانون نہیں ہیں تو باہمی جھگڑوں کے حل میں ان کی طرف رجوع کا حکم کیوں دیا گیا۔

اس طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُونَ حَتَّیَ یُحَکِّمُوکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُواْ فِیْ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُواْ تَسْلِیْما (النساء:۶۵)

پس اللہ کے رسول ﷺ کی دین اسلام میں اس قدر واضح آئینی اور قانونی حیثیت کے انکار کو ایک متعصّبانہ رویہ تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کوئی علمی سوچ نہیں۔

اس طرح شاخت اپنی تحقیق میں اس اہم نکتے کو جانتے بوجھتے نظرانداز کر رہا ہے کہ احادیث کے علاوہ قرآن مجید میں بھی تو ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بیان ہوتے ہیں اگر بالفرض شاخت کی بات مان لی جائے کہ فقہی احادیث کا ذخیرہ علماء نے وضع کیا ہے تو قرآن مجید میں اسلامی قانون سے متعلق جو آیات و ہدایات موجود ہیں ان کا واضح کرنا ہے، اس سے شاخت کا یہ نکتہ بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ کوئی قانون نہیں دیا تھا۔

اس طرح اپنے اس نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام کی پہلی صدی میں اسلامی قانون نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ شاخت نے یہ تک لکھ دیا کہ خلفائے راشدین کے دور میں کوئی قاضی موجود نہیں تھے، خلافت راشدہ تو دور کی بات اللہ کے رسولؐ کے زمانے میں ہی کچھ صحابہ کو مختلف علاقوں میں قاضی اور جج مقرر کیا گیا تھا، جن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، علی بن ابی طالبؓ، عمرو بن العاص، عمرو بن حزم، عتاب بن اسیدؓ، دحیہ کلبیؓ، حذیفہ بن یمانؓ، معقل بن یسار، معاذ بن جبل، ابی بن کعبؓ، عمر بن الخطابؓ، عقبہ بن مرا اور زید بن ثابت شامل ہیں جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

پہلی صدی ہجری میں لکھی جانے والی قانون اسلامی کتب کی اگر بات کریں تو حضرت معاذ بن جبلؓ (۱۸ھ) کے یمن میں بطور قاضی عدالتی فیصلوں کو طاؤس (۱۰۶/۲۳ھ) نے جمع کیا ہے۔ اسی طرح

حضرت زید بن ثابت (م ۴۰ھ) کی وراثت کے مسائل پر کتاب موجود تھی۔حضرت ابو ہریرہؓ سے ان کے شاگرد ہمامہ بن منبہؒ نے دو صحیفہ نقل کیا ہے۔حضرت جابر بن عبداللہؓ سے حضرت عبداللہ بن عقیل کی نکاح و طلاق اور دیت و وراثت پر تحریریں موجود ہیں۔ یہ پہلی صدی ہجری کے قاضیوں اور اسلامی قانون پر لکھی گئی کتب کی چند ایک مثالیں ہیں۔اس حقیقت کی روشنی میں شاخت کا یہ دعویٰ کیسے درست ثابت ہوسکتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں قانون اسلام نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔(۳)

چوتھا اعتراض

شاخت کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ایک بھی فقہی حدیث ایسی نہیں ہے، جس کی نسبت صحیح طور پر رسولؐ سے کی جا سکے نیز فقہاء نے اپنے مسلک کے لحاظ سے وضع حدیث شروع کر دیا۔

شاخت کا یہ اعتراض یا دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہے کیوں کہ شاخت کی تحریروں میں خود اختلاف ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- پہلی بات تو یہ کہ شاخت کے دلائل میں تناقض اور تضاد کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ امام شافعی سے دو پشت پہلے اگر احادیث کی موجودگی کا کوئی اشارہ ملتا ہے تو یہ ایک شاذ اور استثنائی واقعہ ہے۔دوسری جگہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ قدیم مکاتب فقہ نے آغاز ہی سے حدیثوں کا سخت مقابلہ کیا کیوں کہ ان حدیثوں سے ان کے اصول اور مبادی پر سخت ضرب پڑتی تھی۔اگر شاخت کی یہ دونوں باتیں تسلیم کر لی جائیں تو ان کی رائے کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا۔جس کی رو سے وہ فقہا کے لیے یہ لازم قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے مناقشات میں حدیثوں کا ذکر اور ان سے استدلال کریں اس طرح ان مذکورہ دونوں دعویٰ خود باطل ہو جاتا ہے اور اس طرح ان کا یہ پورا دعویٰ کالعدم ثابت ہوتا ہے۔

دوسری نمایاں بات ان کی دروغ گوئی ہے۔ایک مشہور واقعہ بطور مثال پیش ہے۔یہ واقعہ امام احمد بن حنبل اور فتنۂ خلق قرآن کے سلسلے میں عباسی حکومت کے طرزِ عمل سے متعلق ہے۔ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل سے کسی نے قید خانہ میں یہ سوال کیا کہ آخر آپ سے کس بات کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔امام صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کفر کرنے کی بات کہی جاتی ہے۔ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ خلیفہ وقت امام صاحب سے ملنے کے لیے آیا اور تنہائی میں ان سے کہا کہ جس طرح میں اپنے بیٹے ہارون سے محبت کرتا ہوں اس طرح آپ کے حق میں بھی شفیق ہوں، میں چاہتا ہوں کہ آپ میری

باتوں کو قبول کر لیں۔ جواب میں امام احمد نے فرمایا کہ لوگ مجھے کتاب اللہ یا سنت رسولؐ سے کوئی دلیل دیں تو میں آپ کی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اس واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر وضع احادیث کا عمل اتنا ہی آسان ہوتا جیسا کہ شاخت کا دعویٰ ہے کہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ گروہ موجود تھا مگر یہ سب کے سب مسئلہ خلق قرآن میں اپنی تائید کے لیے کوئی ایسی حدیث پیش نہیں کر سکے جو امام احمد کو مطمئن کر سکتی۔ شاخت کی پیش کردہ تحقیقات کے مطابق جب وضع حدیث کا عمل آسان اور رائج تھا تو پھر یہ تمام لوگ دلیل کے طور پر ایک حدیث پیش کرنے سے کیوں قاصر ہیں؟

۳۔شاخت کی تحریر میں جو تیسرا نمایاں نکتہ سامنے آتا ہے وہ استدلال کے بنیادی طریقوں اور اصولوں سے ان کا انحراف ہے۔ مثلاً ان کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر کوئی ایسی حدیث کی کتاب میں تلاش کرتے ہیں جو زمانی لحاظ سے قدیم ترین ہو یا پھر کتاب کے مولف کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ وہ بہ لحاظ وفات قدیم تر ہو لیکن جب وہ مطلوبہ حدیث کی کتابوں میں نہیں ملتی اور ان کے بجائے ایسی کتابوں میں ملتی ہیں جو قدرے بعد کے ہوں تو پھر شاخت یقین و اعتماد کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں۔ پس اسی طرح درمیانی وقفہ میں یہ حدیث وضع کی گئی ہے۔(۴)

کیا فقہ اسلامی رومن لا سے ماخوذ ہے؟

بہت سے مغربی مستشرقین نے آج سے کئی سال پہلے یہ دعویٰ کیا کہ فقہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے، ان کے ان دعویٰ کہ تصدیق یا تردید کرنے کے لیے فقہائے اسلام نے قانون روما کا مطالعہ شروع کیا۔ بڑی تعداد میں علمائے اسلام نے رومن لا کا مطالعہ کیا اور تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ رومن لا کا اسلامی قانون کے ارتقاء پر ذرہ برابر اثر نہیں ہے۔ وہ تمام شواہد اور دعوے جو رومن لا کے اثرات کے بارے میں کیے گئے تھے اور کیے جاتے ہیں وہ سب کے سب بے بنیاد اور غلط تھے۔ رومن لا کی ترتیب، اس کے بنیادی مضامین، اس کے احکام اور اساسی تصورات یہ سب کے سب فکر اسلامی کی ترتیب، مضامین اور بنیادی تصورات کے ساتھ ہر اعتبار سے متعارض ہیں۔ رومن لا کے بنیادی مضامین تین تھے:

(۱) اس قانون میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اشخاص کا قانون کیا ہے؟

(۲) پھر وہ بتاتے ہیں کہ اشیاء یعنی چیزوں اور پراپرٹی کا قانون کیا ہے؟

(۳) پھر وہ اعمال کا قانون بتاتے ہیں۔

گویا افراد، اشیاء اور اعمال ان تین شعبوں میں انھوں نے رومن لا کو تقسیم کیا۔

آپ فقہ اسلامی کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھیں قدیم یا جدید وہ امام شافعی کی کتاب الام یا امام مالک کی موطا ہے یا آج کی فقہ کی کتاب ہو یا کوئی اور معاصر مجموعہ فتاویٰ آپ کو فقہ اسلامی کی کوئی بھی کتاب تین عنوانات کے تحت مرتب نظر نہیں آئے گی۔ اس لیے یہ بنیاد غلط ثابت ہو جاتی ہے اور ابتدا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ اسلامی کا آغاز وارتقاء صرف قرآن اور سنت کی بنیاد پر اور فقہائے اسلام کی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں ہوا، اس کا کوئی تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ رومن لا سے نہیں رہا۔

رومن لا کے ماخذ ومصادر بھی فقہ اسلامی کے مصادر سے بالکل مختلف ہے۔ بادشاہوں کا دیا ہوا مدون قانون مجسٹریٹوں کے دیے ہوئے فیصلے اور بادشاہوں کے مقرر کیے ہوئے ماہرین کے قانون کے فیصلے اور مشورے پر رومن لا کے ماخذ مصادر میں فقہ اسلامی میں ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ فقہ اسلامی نہ تو کسی بادشاہ کا دیا ہوا قانون ہے نہ یہ مجسٹریٹ کے دیے ہوئے ضابطے ہیں۔ کسی بادشاہ یا کسی حکمراں کا فقہ اسلامی کی ترتیب وتدوین میں کوئی حصہ نہیں رہا۔

فقہ اسلامی اور قانون روما دونوں نظاموں میں تصورات کا بنیادی اختلاف موجود ہے۔ قانون کے بعض بنیادی احکام اسلام کی اساسی تعلیمات سے متعارض ہیں۔ اس قانون کے بعض احکام ایسے ہیں جو اسلام کے تصور عدل کے خلاف ہیں بلکہ دنیا کا کوئی بھی متمدن نظام ان تصورات کو آج قبول نہیں کرتا خود روما میں وہ تصورات آج قابل قبول نہیں۔ مثال کے طور پر اس میں لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی مقروض شخص قرض ادا نہ کر سکے تو اسے قتل کر دیا جائے اور اگر قرض کی رقم تھوڑی ہو تو مقروض کو قرض دار کا غلام بنا دیا جائے۔ یہ بات آج کا یا ماضی کا کوئی بھی انصاف پسند انسان قبول نہیں کر سکتا۔

فقہ اسلامی اور رومن لا کی مشترک خصوصیات

کچھ لوگ فقہ اسلامی کو قانون روما سے ماخوذ یا متاثر بتاتے تھے اور یہ سمجھنے لگے ہوں کہ فقہ اسلامی کا کم از کم ابتدائی دو تین صدیوں کا ذخیرہ قانون رومن لا سے ماخوذ ہے اگر ایسا ہے تو اس غلط فہمی کی وجہ چند ایسے مشترک تصورات اور متشابہ اصول ہو سکتے ہیں، جو قانون روما اور فقہ اسلامی دونوں میں پائے جاتے ہیں:

(۱) دونوں قوانین کا آغاز ابتدا محدود تحریری نصوص سے ہوا۔ فقہ اسلامی ساری اساس قرآن پاک اور

احادیث نبویہ پر ہے اور قانون روما کا باقاعدہ آغاز ان دوازدہ الواح سے ہوا جو ۴۵۰ق م قبل مسیح میں لکھی گئی۔

(۲) فقہ اسلامی اور قانون روما میں فرق یہ ہے کہ ان دونوں کا ارتقاء اکثر و بیشتر فقہاء اور قانون دانوں کی تعبیرات اور تشریحات سے ہوا۔

(۳) دونوں نظاموں کے مابین یہ بات مشترک ہے کہ دونوں کے ہاں ان ابتدائی نصوص کو ایک احترام اور تقدس کا درجہ حاصل تھا جن سے آغاز ہوا تھا۔

(۴) دونوں کے مابین یہ نظر آتا ہے کہ ان دونوں نظاموں کو بہت جلد عالمی نظام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

فقہ اسلامی اور قانون روما کے مابین فرق

فقہ اسلامی اور قانون روما کے مابین فرق اور اختلافات اتنا گہرا ہے اور اتنا زیادہ ہے کہ ان میں سے ایک کو دوسرے ماخوذ یا متاثر قرار دینا بنیادی طور پر اور باصراحت غلط ہے۔

(۱) فقہ اسلامی ہمہ گیر تبدیلی اور انسانی زندگی کی بھرپور تبدیلی کی نقیب ہے اس کے برعکس قانون روما سابقہ طرزِ زندگی ہی کی ذرا بہتر تنظیم کا داعی ہے۔

(۲) فقہ اسلامی میں آزادانہ قانون سازی کا دائرہ کار بہت محدود ہے اس کے برعکس قانون میں آزادانہ قانون سازی کا دائرہ لامحدود ہے۔

(۳) فقہ اسلامی اصلاً ایک غیر مدون قانون ہے جب کہ رومن قانون کا طرہ امتیاز یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ مذہبی دنیا کا پہلا مدون قانون ہے۔

ان بنیادی اور اصولی باتوں کے علاوہ بہت سی جزوی اور ذیلی احکام ایسے ہیں جہاں دونوں نظاموں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔

خواتین کے معاملے میں فقہ اسلامی میں ہر بالغ مرد اور عورت کو یکساں شہری اور دیوانی حقوق حاصل ہیں، اس کے برعکس قانون روما میں خواتین مستقل طور پر سرپرستی میں تھیں۔ وہ اپنے نگراں کی اجازت کے بغیر نہ تو جائداد حاصل کر سکتی تھیں اور نہ تصرف کی مجاز تھیں۔ فقہ اسلامی کے احکام کی رو سے مہر شوہر کے ذمے ہوتا ہے اور قانون روما میں مہر بیوی ادا کرتی ہے۔

فقہ اسلامی میں لے پالک اصل بیٹے کی جگہ نہیں لے سکتا جب کہ قانون روما اور اس کے زیر اثر تمام مغربی قوانین میں لے پالک کے وہی احکام ہیں جو اصل صلبی اولاد کے ہوتے ہیں۔ فقہ اسلامی

میں سادگی اور قانون کی روح اور مقصد پر اصل زور ہے تقویٰ، ہیبت اور روحانی پاکیزگی قانون پر عمل درآمد اصل مقصد ہے جب کہ قانون روما اپنے فراح کے اعتبار سے لا مذہبی اور غیر روحانی قانون ہے وہاں سارا زور شکلیات اور مظاہر پر ہے۔ یہاں اصل زور نیت اور ثمرہ پر ہے۔(۵)

مراجع ومصادر

۱۔حکمت قرآن۔ جولائی ستمبر۲۰۱۴ء،ص ۶۷

۲۔اسلام اور مستشرقین، مرتبہ: ضیاءالدین اصلاحی، جلد ششم،ص ۱۲۶

۳۔اسلام اور مستشرقین، حافظ محمد زبیر،ص ۱۵۶

۴۔دراسات فی الحدیث النبویۃ، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی،ص ۴۴۷

۵۔ محاضرات فقہ، ڈاکٹر محمود احمد غازی،ص ۱۶

تدوین قرآن اور مستشرقین

اسامہ احسن صدیقی

تدوین قرآن کے تئیں مستشرقین کے شبہات کے تین بنیادی اغراض ومقاصد ہیں:

(۱) سب سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے متن کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کریں اور اسے غیر معتبر قرار دے کر مسلمانوں کے قرآن مجید پر ایمان ویقین کو کمزور کریں۔

(۲) آیات کی من گھڑت تاویلوں کے ذریعے غلط مفہومات کو عام کرنا۔

(۳) خود قرآن مجید کے تعلق سے یہ افواہ پھیلانا کہ وہ خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد عربی کا کلام ہے تاکہ اس کے تعلق سے غلطیوں کے امکانات کو یقینی بنایا جاسکے۔

مختصر تاریخ تدوین

اسلامی تعلیمات کا ماخذ بنیادی طور پر قرآن مجید اور سنت رسولؐ ہیں، یہی دو بنیادی ستون ہیں جن پر اسلام کا پورا نظام قائم ہے۔ چوں کہ اسلام کے دشمنوں کی ہمیشہ سے یہی چالیں رہی ہیں کہ ان کے تعلق سے شکوک وشبہات پھیلا کر امت مسلمہ کے اس پر ایمان یقین کو کمزور کیا جائے اور اسلام کو پست اور نیچا دکھا کر اس سے متاثر ہونے والوں کو روکا جائے۔ اس لیے امت مسلمہ پر فرض ہے کہ ان تمام باطل ہتھکنڈوں کا منہ توڑ جواب دیں اور اسلام کی حقانیت کو واضح کریں۔

جس وقت دنیا میں بڑے مذاہب کا ظہور ہوا اس وقت لوگوں نے اپنے حافظے پر انحصار کرنے کے علاوہ تحریر کا فن بھی ایجاد کرلیا تھا، جہاں تک تدوین قرآن کا معاملہ ہے تو دنیا سے یہ چیز مخفی نہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ جن پر قرآن کا نزول ہوا حد درجہ قوی حافظے کے مالک تھے اور آپ ﷺ نے قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لیے بیک وقت حفظ اور تحریر دونوں کا استعمال کیا، تاکہ یہ ایک دوسرے کے لیے طاقت کا باعث ہوں اور متن کی صحت کو یقینی بنا کر غلطیوں کے امکان کو کم سے کم کیا جاسکے، تاریخی حقائق سے یہ بات

ثابت ہے کہ واقعہ نبوت کے پانچویں سال قرآن مجید تحریری شکل میں موجود تھا کیوں کہ ابن ہشام کی روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ قرآن کی کچھ آیات کو تحریری شکل میں پڑھ کر متاثر ہوئے تھے، اس سے قبل قرآنی آیات کو تحریری شکل میں نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے علاوہ نازل ہونے والی آیات چھوٹی چھوٹی اور تعداد میں بہت کم تھیں اور ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ رسول اللہؐ کے حافظے سے یہ محو ہو جائیں اور یہ بات قابل فہم بھی معلوم ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات کے باقی اٹھارہ برس کے دوران مسلمانوں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہوا، قرآنی نقول کی تعداد بھی اسی قدر بڑھتی چلی گئی۔

نازل شدہ کلام کو رسول اللہ ﷺ بار بار صحابہ کے سامنے دہراتے اور وقفوں وقفوں سے وہ ترتیب بھی بتاتے جس کے تحت اس کلام کو متعلقہ سورہ کے ساتھ شامل کرنا ہوتا تھا: **فکان اذا انزل علیه الشیء دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا هذا یکتب، فیقول ضعوا هذا فی السورة التی یذکر فیها کذا و کذا** (مختصر کنز العمال، ص ۴۸)

اور صحیح روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نازل شدہ کلام کا ایک دور ہر سال رمضان المبارک میں حضرت جبریلؑ کی موجودگی میں مکمل کرتے۔

قالت ام سلمة: کان جبریل علیه السلام یملی علی النبی صلی الله علیه وسلم (رواه الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد)

جس سال آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے دو مرتبہ دور کرایا۔ قرآن کے اس دور میں صحابہ بھی شامل ہوتے اور رسول اللہؐ کی تلاوت کے مطابق اپنے اپنے نقول کو درست کرتے۔

چنانچہ حضرت زیدؓ کا بیان ہے: فان کان فیہ سقط اقامہ (مجمع الزوائد، ص ۶۰) آپ کے وصال کے بعد خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو قرآن مجید کی ایک مصدقہ نقل تیار کرنے کی ذمے داری سونپی، حضرت زید خود بھی حافظ تھے اور رسول اللہؐ کے آخری دور میں بھی شریک تھے جو کہ حضرت جبریلؑ کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ انتہائی مصدقہ روایات کے مطابق صرف دو آیتیں ایسی تھیں جن کی شہادت کے لیے دستاویز دستیاب ہوئی ورنہ باقی تمام قرآن مجید کی تصدیق ان گنت مصدقہ مخطوطات سے ہوگئی۔ اس طرح یہ مصدقہ نقل تیار ہوئی جس کو مصحف کہا گیا۔ آپؐ کے بعد آپ کے جانشین حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کی مناسبت سے کافی تعداد

میں قرآن مجید کی مصدقہ نقول تیار کروائے اور پھر صوبائی حکومتوں میں بھجوایا تا کہ مفسدوں کو تحریف کا موقع نہ مل سکے۔

اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے۔آپ کے دورِ خلافت میں یہ بات سننے میں آئی کہ آرمینیا کے علاقے میں قرآن مجید کے نسخے ایسے ملے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔یہ اطلاع ملتے ہی آپ نے حضرت زیدؓ کی قیادت میں کاتبین وحی کی ایک جماعت بٹھائی اور ''مصحف صدیقی'' کے مطابق قرآن کے سات مصدقہ نسخے تیار کروائے، پھر ان نقول کی مدینہ میں حفاظ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں تصدیق کی گئی اور پھر یہ نسخے صوبائی صدر مقامات پر بھجوائے گئے تا کہ آئندہ تمام نقول ان مصدقہ نسخوں کے مطابق تیار کرائے جائیں اور مصحف صدیقی کو مصدقہ قرار دے کر تمام دیگر نسخے جلوا دیے گئے تا کہ مستقبل میں کوئی فتنہ نہ پیدا ہو۔یہ آپؓ ہی کی حکمت کا اعجاز ہے کہ آج دنیا کے ایک حصے میں موجود قرآن دوسرے حصے کے قرآن سے ذرا سا بھی مختلف نہیں۔حضرت عثمانؓ کے دور کے تیار کردہ نسخے آہستہ آہستہ ختم ہو گئے، البتہ ان میں سے ایک نسخہ استنبول اور ایک نامکمل حالت میں تاشقند میں محفوظ ہے۔

لہٰذا قرآن مجید کے اپنی اصل زبان میں برقرار رہنے، رسول اللہ ﷺ کی ذاتی نگرانی میں اس کی ترتیب و تدوین مکمل ہونے نیز ہر نسل میں بڑی تعداد میں حفاظ کرام کے اپنے حافظے کے علاوہ تحریری صورت میں محفوظ کرنے کے دوہرے عمل کے جاری رہنے اور باصلاحیت اساتذہ کی زیرِ نگرانی تدریس نے اس میں تحریف کے امکانات ختم کر دیے اور اس طرح مسلمانوں کی یہ مقدس کتاب تضادات سے پاک ہونے کی خاصیت سے بہرہ ور ہے۔

تدوین قرآن پر مستشرقین کے شبہات اور ان کا ازالہ

پہلا اعتراض: مشہور مستشرق بُہل نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حفاظت کا انحصار آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے حافظے پر تھا، وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ قرآن میں ہے: سَنُقْرِئُکَ فَلاَ تَنْسیٰ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ ''ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے۔''

''مگر جتنا اللہ چاہے'' سے مستشرق بہل یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ابتدائی زمانے کی قرآنی آیات محفوظ نہ ہوں یہ امکانات موجود ہے۔

جواب: مستشرق بہل کا یہ اعتراض درحقیقت علم صحیح نہ ہونے کی دلیل ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ الا ما شاء اللہ سے مراد منسوخ شدہ آیتیں ہیں نہ کہ غیر منسوخ، اس سے یہ دلیل نہیں نکلتی کہ غیر منسوخ آیات کے فراموش ہوجانے یا بھول جانے کا کوئی امکان ہے۔ اوران کی یہ بات کہ ابتدائی زمانے میں قرآن کی حفاظت کا انحصار صرف حافظے پر تھا تو یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے وقت قرآن باقاعدہ تحریری شکل میں موجود تھا۔

دوسرا اعتراض: مارگولیتھ نے مسند احمد کی ایک روایت کے حوالے سے قرآن کریم کی حفاظت پر ایک اعتراض کیا ہے اور وہ یہ ہے:

> ''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رجم کی آیت اور بڑے آدمی کے دس رضعات کی آیت نازل ہوئی تھیں، یہ آیتیں میرے گھر میں ایک تخت کے نیچے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں۔ جب آں حضرت ﷺ کو (مرض وفات کی) تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئے۔ ہمارا ایک پالتو جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھالیا۔''

مارگولیتھ اس سے یہ بات نکالتے ہیں کہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں حضرت عائشہؓ سے ضائع ہوگئی تھیں۔

جواب: لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جو آیتیں ان کے تخت کے نیچے تھیں وہ منسوخ شدہ آیتیں تھیں جنہیں حضرت عائشہ نے بطور یادگار حفاظت کے ساتھ رکھ لیا تھا اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے اور بذات خود حضرت عائشہ بھی ان آیتوں کے منسوخ ہونے کی قائل ہیں، ورنہ اگر یہ آیات حضرت عائشہؓ کے نزدیک قرآن کریم کا جز ہوتی تو کم از کم ان کو تو یاد تھیں، وہ ان کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں، مگر انھوں نے ساری عمر یہ کوشش نہیں کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ آیات محض ایک علمی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں، لہٰذا اس واقعے سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

تیسرا اعتراض: مستشرق ڈی، ایس، مارگولیتھ نے صحیحین کی ایک حدیث کی بنا پر قرآن کریم کی حفاظت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک رات آپ ﷺ نے ایک صحابی کو مسجد میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا: **رحمہ اللہ لقد اذکرنی آیت کنت انسیتھا** ''اللہ ان پر رحم کرے انھوں نے مجھے ایک ایسی آیت یاد دلا دی جو مجھ سے بھول گئی تھی۔'' (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، ص ۷۵۳)

مستشرق موصوف کے اس روایت کے بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ ایک آیت

بھول سکتے ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ آیتیں بھی بھول سکتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ قرآن مجید اس وقت تحریری مشکل میں موجود نہیں تھا اور نہ آپ بھولتے نہیں۔

جواب: حقیقت واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک بات انسان کو یاد ہوتی ہے مگر چوں کہ عرصہ دراز سے اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی طرف خیال جاتا ہے، اس لیے وہ ذہن میں مستحضر نہیں ہوتی اور جب کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ فوراً تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت میں بھول نہیں بلکہ عارضی طور پر خیال سے نکل جانا ہوتا ہے۔ یہ چیز آپ کو پیش آئی تھی، اس لیے ایسے واقعات کو بنیاد بنا کر آپ کی طرف نسیان کی نسبت کرنا انتہا درجے کی بے انصافی ہے۔ بلکہ اس واقعے سے تو ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت اتنے بے شمار افراد کو یاد کرا دی گئی تھی کہ اگر کسی وقت آں حضرت ﷺ کو مستحضر نہ رہی تب بھی اس کے ضائع ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

رہی یہ بات کہ قرآن مکتوب شکل میں موجود نہیں تھا تو مذکورہ واقعے سے یہ بات کہاں نکلتی ہے۔ کیا مستشرق موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک مرتبہ لکھ لی گئی وہ کبھی خیال سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں نکل سکتی؟ پھر دنیا یہ جانتی ہے کہ آں حضرت ﷺ اُمّی تھے لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لیے آپ کو قرآن کو یاد رکھنے کا کتابت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

مراجع ومصادر

۱۔ تفسیروں میں اسرائیلیات، مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی مدنی
۲۔ تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۳۔ قرآن مجید اور مستشرقین، مولانا جرجیس کریمی
۴۔ فکر استشراق اور عالم اسلام میں اس کا اثر ونفوذ، ڈاکٹر محمد شہباز منج
۵۔ علوم القرآن، جسٹس محمد تقی عثمانی
۶۔ علوم القرآن، صبحی صالح
۷۔ تدوین قرآن [یعنی قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر]، مولانا مناظر احسن گیلانی
۸۔ اسلام اور مستشرقین، مجلّہ
۹۔ اسلام کیا ہے؟، ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۱۰۔ حکمت قرآن، مجلّہ

حدیث اور مستشرقین

عاطف آصف

کہنے کو تو مستشرقین(Orientalists) نے قرآن، سیرت،تاریخ، فقہ بلکہ اسلام کے ہر ہر گوشے پر اعتراضات وارد کیے ہیں،اور اپنے تیر تشکیک کا ہدف بنایا ہے،مگر حدیث (tradition) کے خلاف ان کی محنت وعنایت کچھ خاص نوعیت کی رہی ہے،اس کی سب سے اہم وجہ شاید یہ ہے کی حدیث کو دین اسلام میں قرآن کے بعد دوسرا تشریعی مقام حاصل ہے،لہاذا اگر اس کی تشریعی حیثیت ملغی ہوگئی تو اسلام کو ایک کامل مکمل دین ثابت کرنا محال ہو جائے گا اور مزید برآں قرآن کی من چاہی تفسیر کرنے میں کوئی چیز آڑے بھی نہیں آئے گی، چنانچہ مستشرقین کی ایک جماعت جس میں گولڈ زیہر، آرتھر جیفری، نابیا ایبٹ، روبسون اور جوزف شاخت کا نام سرفہرست ہے۔انہوں نے حدیث پر چوطرفہ حملے شروع کیے،کبھی تدوین حدیث کے تئیں اعتراضات اٹھائے تو کبھی متون حدیث کے تعلق سے شبہات پھیلائے اور کبھی احادیث کی اسناد کو وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے 200 سال بعد کی پیداوار قرار دیا،جس کا مقصد وحید حدیث کی عدم حجیت کا اثبات ہے۔۔

حدیث کے تئیں ان کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث فرضی وجعلی ہیں، بعد کی پیداوار ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے چنانچہ مشہور مستشرق گولڈ زیہر(ziher Gold Ignaz) جسے مستشرقین کی پیشوائی کا مقام حاصل ہے،لکھتا ہے:

> the hadith will not serve as a document of the infancy of Islam, but rather as a reflection of the tendencies which appeared in the community during the mature stages of its development.(1)
>
> ”حدیث اسلام کے عہد طفولیت کی دستاویز نہیں بلکہ یہ مسلم سوسائٹی کے پختہ تر مراحل کے رجحانات کا عکس ہے۔“

مشہور مستشرق جوزف شاخت (Josef Schacht) فقہی اور قانونی احادیث پر تحقیق پیش کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا کہ:

“We shall not meet any legal tradition from the prophet while can be considered authentic.”(2)

کسی ایک بھی فقہی حدیث کی نسبت اللہ کے رسول کی طرف کرنا صحیح نہیں، اس لئے کی یہ روایات حقیقتاً بعد کے ادوار کے قانونی وفقہی نظریات کا فرضی اظہار ہیں۔“

ایک دوسرے مستشرق اے گیولم (A. Guillaume) نے کہا:

”حدیث کا اکثر ذخیرہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اڑھائی سو سال بعد کی پیداوار ہے۔“(۳)

آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) کا خیال ہے کی احادیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد ان مذہبی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے وجود میں آئیں جن سے متعلق قرآن میں کوئی رہنمائی نہ ملی چنانچہ وہ لکھتا ہے:

After the prophet’s death however the growing community of his followers found that great many problems of religion and even more of community life where arising for which there was no specific guide Ness in the Quran was there for short in the tradition Hadith as towards the prophet has said and done.

”پیغمبر کے انتقال کے بعد ان کے پیروکاروں کی بڑھتی ہوئی جماعت نے یہ محسوس کیا کہ مذہبی اور معاشرتی زندگی میں بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن میں کوئی رہنمائی موجود نہیں لہذا ایسے مسائل کے حل کے لیے احادیث کی تلاش شروع کی گئی۔“(۴)

ولیم جمز ڈیورانٹ (W.J.D) کا کہنا ہے:

وہ تمام احادیث جو آپ صلی وسلم کے معجزات سے متعلق ہیں جعلی اور فرضی ہیں آپ صلی اللہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔“(۵)

مستشرقین کے ان اعتراض کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا امریکانا کا باحث لکھتا ہے:

When‹after Mohammed's death,the Muslims faced problems that the koran alone did not solved, they naturally sough guidance what people before them had done........more often fabrication was advanced for more pious reasons.(6)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسلمانوں کو ایسے مسائل کا سامنا ہوا جو صرف قرآن سے حل نہ ہو سکتے تھے تو لوگوں نے فطری طور پر اپنے اسلاف کے عمل سے رہنمائی چاہی، آدمی اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے جو مضبوط ترین دلیل دے سکتا تھا وہ یہ تھی کہ محمد اور ان کے اصحاب نے ایسا ہی کیا تھا یا اسی نوعیت کی بات کہی تھی، لیکن پیش آمدہ مسئلہ کے لئے ہمیشہ اسلاف کے عمل سے نظیر ملنا ناممکن تھا چنانچہ مسلمانوں نے اپنے اپنے مفاد کی موید احادیث گھڑنا شروع کر دیں، سیاسی معرکہ آرائی میں معاونت کی غرض سے علماء کو جعلی احادیث کو مستند بنانے پر اکسانے کے واقعات معلوم و معروف ہیں، نیک مقاصد کے لیے بھی کثرت سے احادیث وضع کی گئیں"۔

تجزیہ

مستشرقین اپنے اقوال میں گویا یہ تاثر دینا چاہ رہے ہیں کہ عہد نبوی یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے وقت دین اسلام مکمل نہیں ہوا تھا، اس کی جڑیں ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جب نئے نئے مسائل پیش آتے اور قرآن میں ان کا حل نہ ملتا تو لوگ ان کے حل کے لیے باتیں گڑھتے اور ان کو مستند (Authentic) بنانے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔۔

لیکن یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا واقعی ایسا تھا کہ وفاتِ نبوی کے وقت دین اسلام کی جڑیں مستحکم (stable) نہیں ہوئی تھیں؟ کیا اہل اسلام کے پاس کوئی ایسا منظم ضابطہ حیات نہیں تھا جو زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کرے؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رحلت محمد صلی اللہ وسلم سے پہلے ہی اللہ نے اسلام کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیا تھا: **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا** اور حضرت محمد صلی وسلم نے مصادر اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: **ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم به کتاب الله وسنة رسوله**"۔

چنانچہ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اسلام کی بنیادیں وفات محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے وقت پوری طرح سے مضبوط ہوچکی تھیں، سیاست(politics)، معیشت (economy)، عقائد(dogma)، گویا کی زندگی کے ہر باب میں اسلام لوگوں کی مکمل طور پر رہنمائی کر رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو اس دور کی سب سے ترقی یافتہ اور متمدن قوموں پر بھی اس دین اسلام کو نافذ کیا اور تاریخ گواہ ہے کی ان ترقی یافتہ ملکوں میں ایسا نظام امن قائم کیا کہ وہ قوم اپنے سابقہ تہذیب وتمدن کو بھول بیٹھیں اور اسلام کے نظام امن اور نظام قانون سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، جو اس بات کی دلیل ہے کی اسلام اس وقت کا کامل مکمل ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ اگر وفات نبوی کے وقت اسلام کامل ومکمل نہیں ہوا تھا جیسا کہ مستشرقین کا دعویٰ ہے تو عقائد، عبادات، اخلاقیات کے باب میں پوری دنیا کے مسلمانوں میں اس قدر یگانگت (nearness) نہ ہوتی، اس لیے کہ جزیرۃ العرب کے مسلمانوں نے اولا اسلام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلایا، اب اگر خود ان کے پاس منظّم اور مستحکم نظام نہ ہوتا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کے عقائد، عبادات وغیرہ میں ایک گونا فرق کا ہونا لازمی تھا اور اگر احادیث کی غالب اکثریت ابتدائی دوصدیوں کے خلفشار اور انتشار کا نتیجہ ہوتیں تو اس کا حتمی نتیجہ یہ ہوتا کہ شمالی افریقہ میں بودوباش رکھنے والے مسلمان کی عبادت ایک چینی مسلمان سے قطعی مختلف ہوتی اس لیے کی دونوں کے آداب واطوار اور طرز وبودوماند میں فرق پایا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے مسلمان عقائد، عبادات میں بالکل متحد ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ عہد اول میں اسلام مکمل ومستحکم ہو چکا تھا۔(۷)

اب جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام اپنے آپ میں عہد نبوی ہی سے قرآن وسنت کی شکل میں ایک مکمل نظام اور تمام مسائل کا حل رکھتا ہے تو پھر یہ کہنا کیوں کر مناسب ہوسکتا ہے کہ عہد نبوی کے دو سال بعد جب نت نئے مسائل کا حل قرآن میں نہ ملا تو علماء نے ان کا حل نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا؟

علاوہ ازیں، بہت سے ایسے مستشرقین بھی ہیں جنھوں نے نہ صرف اس کا اعتراف کیا ہے کہ احادیث عہد نبوی ہی میں وجود میں آئیں اور صحابہ کرام نے ان پر عمل بھی کیا بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعد کے مسلمانوں تک آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات قابلِ اعتماد ذرائع سے منتقل ہوئیں، چنانچہ فلپ کے ہٹی لکھتا ہے:

Through his lifetime Mohammed served as god's spokesman, thereby performing the triple function of legislation judge, and executive the usage of prophet)Sunnah,‘‘custom''''use''(including his deeds, utterances and tacit approval was available. It clarified the scriptural text, elaborated on it, supplemented it, and thus fulfilled new demands. the Prophetic Sunnah became in the first century after the hijrah the object of intensive study, next to the study of the Koran itself, the research involved collection, verification and recording.(8)

’’محمد ﷺ نے اپنی پوری زندگی خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔اس طرح وہ ایک قانون ساز، جج، اور منتظم کے سہ گونہ فرایض سرانجام دیے۔(حضور کے بعد) آپ کی سنت یعنی آپ کی عادات، آپ کا طریقہ کار، آپ کے اقوال، آپ کے افعال اور آپ کی تقریرات دستیاب تھیں۔یہ چیزیں وحی کے متن کے توضیح وتفسیر کرتیں، اور اس طرح نئے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں۔ہجرت کے بعد کی پہلی صدی میں احادیث قرآن کریم کے بعد زبردست تحقیق اور مطالعہ کا موضوع قرار پائیں۔احادیث کی تحقیق میں احادیث کو جمع کرنے، انکی جانچ پڑتال کرنیاورانکو ریکارڈ کرنے کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھا گیا۔"

اس مستشرق کے مطابق احادیث قرآن کی تفسیر ہیں، اور پہلی صدی میں ہی احادیث کی تحقیق کی گئی، انہیں جمع برکھا گیا اور پھر انہیں محفوظ کیا گیا۔

جون گلب (John bagot glabb) لکھتا ہے:

There were many minor legal and administrative problems to settle, his decision in which were passed down in Muslim tradition and became unchanging laws for hundreds of millions of millions of person, for centuries to come.(9)

بہت سے کم اہمیت کے قانونی اور انتظامی امور کے مسایل طے کرنا باقی تھے۔ایسے امور کے متعلق محمد ﷺ کے فیصلے اسلامی روایات کی شکل میں بعد کے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوے اور صدیوں تک کروڑوں مسلمانوں کے لیے ناقابل تغیر قانون کی حیثیت اختیار کر گئے‘‘۔

یہاں پر گلب نے بھی احادیث کو اللہ کے رسول کے فیصلے اور اقوال سے تعبیر کیا ہے، دوسرے مستشرقین کے برعکس کہ وہ انہیں بعد کے مسلمانوں کی اختراع گردانتے ہیں۔ان کے علاوہ ڈاکٹر مورس بکا پینے بھی اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور احادیث کی جانچ پڑتال کے لیے مسلمانوں کی محنت کو سراہا ہے۔(۱۰)

مستشرقین نے اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے متعدد دلائل (arguments) بھی پیش کیے ہیں مگر ان کے اعتراضات کی طرح ان کے دلائل بھی حباب کے مانند ہیں، ذیل میں ان کے دلائل کا تجزیاتی مطالعہ پیش خدمت ہے۔

اول: مستشرقین کا کہنا ہے کہ اموی حکمران اور علمائے صالحین کے مابین شدید چپقلش تھی، اور علمائے صالحین انکے خلاف اور اہل بیت کے حق میں احادیث وضع کیا کرتے تھے،حکومت بھی وضع حدیث میں شامل تھی، ان کا کہنا ہے کہ امیر معاویہ نے اپنے وزیر مغیرہ ابن شعبہ کو علی رضی اللہ عنہٗ کے خلاف وضع حدیث کا حکم دیا، نیز ان کا یہ بھی دعوی ہے کہ علمائے مدینہ بھی وضاع تھے، بلکہ وضع حدیث کی شروعات انہوں نے ہی کی۔(۱۱)

سب سے پہلے ہم اس بات پر نظر ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں کہ کیا واقعی اموی حکمراں اور علمائے صالحین کے درمیان نزاع و اختلاف تھا چنانچہ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہی وضع حدیث کے تیئں مستشرق کا یہ دعوی ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، اس لیے کہ وہ علماء جنہوں نے احادیث کی جمع و تدوین نیز روایت و تنقید کا بیڑا اٹھایا جیسے سعید ابن المسیب، ابوبکر ابن عبدالرحمٰن ابن حارث، سالم مولیٰ عبداللہ ابن عمر، نافع مولی ابن عمر، سلیمان بن یسار، امام زہری، عطا، حسن بصری وغیرہ ان سے کبھی بھی کسی طرح کا اختلاف بنوامیہ کے حکمرانوں سے نہیں ملتا، سوائے ایک اختلاف کے جو سعید ابن المسیب کا خلیفہ عبدالملک سے اس بات کو لے کر ہوا تھا کہ خلیفہ بیک وقت اپنے دونوں بیٹوں کی خلافت پر ابن المسیب سے بیعت چاہتا تھا مگر ابن المسیب نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا کہ "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في وقت واحد.(۱۲)

اب رہی یہ بات کی علویوں کے حق و مدح میں وضع حدیث تو یہ کام علمائے صالحین نے نہیں بلکہ شیعوں اور خوارج نیکیا، اہل مدینہ نے تو ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، نہ کہ ان کے حق و مدح میں احادیث

گھڑی، رہی بات ذخیرہ احادیث میں اہل بیت کے حق میں مدح کرتی ہوئی احادیث تو قرآن میں بھی بعض صحابہ کی تعریف میں آیات نازل ہوئی ہیں تو کیا وہ آیتیں بھی فرضی وجعلی ہیں؟۔

رہا مستشرقین کا یہ دعوی کی کی علمائے صالحین کے ردعمل میں اموی حکمران نے بھی وضع حدیث میں حصہ لیا تو اس دعوے کا تعاقب کرتے ہوئے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کی تاریخ ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اموی حکومت نے کبھی اپنے آراء وافکار کو پھیلانے کے لیے احادیث وضع کی ہے، پھر اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ انہوں نے ایسا کیا تو وہ تمام روایات جو امویوں نے گھڑی تھی کہاں گئی؟ ہمارے علماء نے تو ہر حدیث کو اسناد(chain) کے ساتھ نقل کیا ہے اور وہ تمام سندیں صحیح حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں تو آخر ہم ان لاکھوں حدیثوں کے رواۃ میں کسی بھی اموی حکمران یا عامل مثلا عبدالملک، یزید، ولید، حجاج، خالد بن عبداللہ القسری وغیرہ کے اسماء کیوں نہیں ملتے؟ اگر ان کا وجود تھا تو تاریخ کے کن گوشوں میں گم ہو گئے؟ لہذا یہ ثابت ہوا کی مستشرقین کا اعتراض بے بنیاد عمارت کی طرح ہے جو زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی۔(۱۳)

اب رہی وہ روایت جسے بنیاد بنا کر مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ اپنے گورنر کو وضع حدیث کا حکم دیتے تھے، تو ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ ان کے اعتراض اور مذکورہ روایات کا دور دور سے کوئی تعلق نہیں ہے، روایت میں ہیکہ امیر معاویہ نے کہا "علی کو گالیاں دینے میں سستی سے کام نہ لو، عثمان کے لیے خدا کی رحمت طلب کرو اور اصحاب علی کو برا بھلا کہو، ان کی احادیث کا مقابلہ کرو، ان کے برخلاف عثمان اور آل عثمان کی مدد کرو ان کا قرب حاصل کرو اور ان کی باتیں سنو'

غور کیجئے! کیا اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت معاویہ نے مغیرہ سے کہا ہو کہ اے مغیرہ حضرت عثمان کے حق میں احادیث وضع کرو، ان کے اس تبصرے سے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ حضرت عثمان کے حق میں بولنے کا مطلب ان کے حق میں حدیث گڑھنا ہے، تو یہ استنتاج صحیح نہیں ہے۔

مزید برآں مستشرقین نے حضرت معاویہ کی روایت ذکر کرنے میں عدل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس میں بعض الفاظ کی تبدیلی کر دی ہے جو ان کی امانت و دیانت کی عکاسی کرتا ہے۔(۱۴)

رہا مستشرق گولڈزیہر کا یہ کہنا کہ علمائے اہل مدینہ بھی احادیث وضع کیا کرتے تھے بلکہ وضع حدیث کی شروعات انہوں نے ہی کی تو ان کے قول پر خود مختلف ناحیت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

اول یہ کہ اگر علمائے مدینہ نے احادیث وضع کی تو کیا اس زمانے میں علماء صرف علمائے مدینہ ہی تھے؟ کیا اس وقت مکہ، کوفہ، بصرہ، مصر، شام اور یمن وغیرہ دوسرے شہروں میں علماء یا صحابہ موجود نہ تھے؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ضعیف العمر صحابہ کو کو چھوڑ کر مکہ میں عطاء، طاؤس، مجاہد، عمرو بنِ دینار، ابن جریج، ابن عیینہ، بصرہ میں حسن بصری، سیرین، مسلم بن یسار، ابو ایوب سختیانی، مطرف بن عبداللہ، کوفہ میں علقمہ، اسود، عمر بن شرحبیل، مسروق، سوید بن غفلہ، عمر بن میمون، ابراہیم نخعی، عامر شعبی، سعید بن جبیر، قاسم ابن عبدالرحمٰن بن مسعود وغیرہ جبکہ شام و یمن میں ابو ادریس خولانی، خالد بن معدان، عبدالرحمٰن بن جبیر، مکحول اور مطرف وغیرہ پائے کہ علمائے دین موجود تھے، تو کیا یہ علماء بھی وضع احادیث میں علمائے مدینہ کے شریک تھے؟ اگر شریک تھے تو کس مجلس میں جمع ہو کر انہوں نے وضع حدیث کی سازش رچی تھی؟ اور اگر سب کے سب واضعین حدیث تھے تو انہوں نے ایک دوسرے سے احادیث کیوں اخذ کی؟ کیوں نہ اپنے پاس سے گڑھ کر اس کو خود بیان کیا؟ اور اگر وہ شریک نہیں تھے تو علمائے مدینہ کی تی؟ یں انہوں نے سکوت کیوں اختیار کیا؟ اور ان سے احادیث نقل کیوں کی؟ نیز ان علماء یعنی علمائے اہل مدینہ پر انہوں نے جرح و تنقید کیوں نہیں کی؟ تنقید تو دور کی بات ہم دیکھتے ہیں کی وہ علمائے اہل مدینہ کی احادیث کو اصح الاسانید گردانتے تھے، مزید برآں عبدالملک کا امام زہری کو یہ مشورہ دینا کہ وہ علمائے مدینہ سے حدیث سیکھیں، بھی اس امر پر دال ہے کہ وہ سب ثقہ بلکہ اوثق تھے۔(۱۵)

اگر مدینہ واضعین حدیث کا گڑھ تھا تو آخر مذکورہ بالا لوگوں نے اس کی تعدیل و توثیق کیوں کی؟ یہ تمام حقائق مستشرقین کے دعووں کی پرزور تردید کرتے ہوئے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

پھر اگر علماء مدینہ وضاع تھے تو سعید بن میسّب کو تو انکا سردار ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ علمائے مدینہ میں چوٹی کے عالم تھے، لیکن مستشرقین نے ان پر واضع حدیث کا الزام کیوں نہیں لگایا؟ ان کو واضع حدیث ثابت کرنے سے خواہ کسی جھوٹی روایت کی بنیاد پر ہی کیوں کر قاصر رہے؟ (۱۶) کیا یہ امر بھی ان کے دعوے کا بطلان نہیں کر رہا۔

دوم: مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ راویان حدیث ذاتی مفاد کے لئے بھی احادیث وضع کیا کرتے تھے۔(۱۷) مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ابن عمر سے مروی ترمذی کی ایک روایت کے مطابق آپ نے کتوں کو مارنے کا حکم صادر فرمایا اور اس میں شکار اور جانوروں کی رکھوالی کے کتوں کو مستثنیٰ رکھا اور بعد میں ابن عمر کو یہ

پتہ چلا کی ابو ہریرہ بھی یہی روایت رسول ﷺ سے نقل کرتے ہیں لیکن وہ شکار اور رکھوالی کے علاوہ کھیتی کے کتے کا بھی استثنیٰ کرتے ہیں اس پر ابن عمر نے کہا کہ ابو ہریرہ کھیتی کے مالک ہیں۔

عن عمر ابن دینار عن ابن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم امر بقتل الكلاب الا كلب صيد وكلب غنم او كلب ماشية قيل لابن عمر ان ابا هريره يقول او كلب زرع فقال ابن عمر: ان لابی هريرة زرعا.

اب ابن عمر کے قول "ان لابی هريرة زرعا" سے گولڈ زیہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عبداللہ ابن عمر نے ابوھریرہ پر یہ الزام عائد کیا کہ چونکہ وہ ایک کھیتی کے مالک ہیں اس لیے اپنی روایت میں اپنی ذاتی مفاد کی غرض سے استثنیٰ کو شامل کر دیا یا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے ذاتی مسائل یا مفاد کی خاطر احادیث گڑھنے کا عمل صحابہ کرام ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> This remark of ibne Umer is characteristic of the doubt about the good faith of the transmitter that existed even in the earliest period of the formation of tradition.(18)

تجزیہ

گولڈ زیہر اور گیولم کا یہ دعوی صحیح نہیں کیونکہ کھیتی کے کتے کا استثنا صرف ابو ہریرہ نے نہیں کیا ہے بلکہ اور بھی صحابہ کرام نے کیا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عن سفيان بن ابی زهير قال سمعت النبی صلی الله عليه وسلم يقول من اقتنى كلبا لا يغنى عنه زرعا ولا ضرعا نقص من عمله كل يوم قيراط)قيل له:انت سمعت من النبی صلی الله عليه وسلم؟ قال ای ورب هذا المسجد.(مسند ابن ماجه ,كتاب الصيد).

''سفیان بن ابی زہیر کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کوئی کتا پالا، جو اس کی کھیتی یا مویشیوں کے کام کا نہ ہو تو اس کے عمل میں سے روزآنہ ایک قیراط اجر کم کیا جائے گا، ان سے کہا گیا کہ کیا یہ بات آپ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، اس مسجد کے رب کی قسم۔''

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عن عبد اللہ بن مغفل ان رسول اللہ امر بقتل الکلاب ثم قال ما لھم وللکلاب ثم رخص لھم فی قلب الزرع. (ابن ماجہ, کتاب الصید).

''عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول نے کتوں کو مارنے کا حکم دیا اور کہا یہ کتے آن کے کس کام کے؟ پھر آپ نے کھیتی کے کتے کے بارے میں رخصت دیدی۔''

اور پھر ابن عمر کے قول (ان لابی ھریرۃ زرعا) سے گولڈ زیہر جو یہ نتیجہ نکال رہا ہے کہ ابنِ عمر ابو ھریرہ پر وضع حدیث کا الزام (accusation) لگا رہے ہیں، اس کی کیا دلیل ہے؟ کیا ابنِ عمر نے ابو ھریرہ کو صراحتاً واضع حدیث کہا؟ کیا انہوں نے کہا کہ کھیتی کے کتے کا استثناء اللہ کے رسول نے نہیں بلکہ ابو ہریرہ نے کیا ہے؟ اس کے برعکس ابنِ عمر نے فرمایا: یرحم اللہ ابا ہریرۃ، اگر ابن عمر کو ابو ہریرہ کو واضع حدیث ثابت کرنا ہوتا وہ ان کے حق میں دعائیہ کلمات کیوں کہتے؟ (۱۹)

مجموعی طور پر ابن عمر کے تبصرے کا معنی و مفہوم صرف اور صرف یہ ہے کہ اللہ ان پر رحم فرمائے، وہ کھیتی والے تھے لہذا انہوں نے اس بات کو یاد رکھا کہ کھیتی کا کتا بھی استثنیٰ میں شامل ہے۔ حافظ زبیر صاحب لکھتے ہیں "یہ تو ابو ہریرہ پر الزام کے بجائے ان کے حق میں تعریفی کلمات ہیں جنہیں گولڈ زیہر نے کمال فن سے اعتراض بنانے کی کوشش کی ہے۔'' (۲۰)

مستشرقین کا کہنا ہے کہ نیک مقاصد کے لئے بھی احادیث وضع کی گئیں، چنانچہ مشہور مستشرق ونسنک لکھتا ہے کہ محمد کی وفات کے چند دہائیوں کے بعد لوگوں کے افکار و عمل ترقی پذیر ہوے اور اس تطور (development) نے اسلام کے روحانی پیشواؤں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اسلام کی اسپرٹ (Sprite) کو احادیث میں بیان کریں چنانچہ انہوں نے اس نیک مقصد کے لیے "**العقیدة و الشھادة**" اور "بنی الاسلام علی خمس" دونوں احادیث وضع کیں۔ اس کے الفاظ ہیں۔???

> Theory and practice,as they were developed during some decades after Muhammad's death, allowed the leading powers in spiritual matters to express the essentials of Islam in tradition of which the confession of faith)shahada(and the enumeration of the five pillars of Islam are the most important. (21)

ونسنک (Wensinck) کا کہنا ہے کہ محمد ﷺ (یعنی مسلمانوں) کے پاس کوئی ایسا اصول نہ تھا جس کے ذریعے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوں، جب وہ شام میں داخل ہوے اور مسیحیوں کے نزدیک دین عیسائیت میں داخل ہونے کے اصول وضوابط دیکھے تو ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہمارے دین میں بھی اس طرح کا کوئی اصول یا کوئی صیغہ ہونا چاہیے، چنانچہ انہوں نے ان دونوں حدیثوں کی شکل میں اپنے مقصد کو پورا کیا۔(۲۲)

تجزیہ

معترض کا یہ اعتراض درست نہیں، اس لئے کی کلمہ شہادت ہر نماز میں دو رکعت پر پڑھے جانے والے تشہد کا جزء ہے اور نماز تو عہد نبوی ہیں سے رائج مروج ہے لہٰذا یہ کہنا کہ شہادت والی حدیث یعنی حدیث جبریل بعد میں وجود میں آئی درست نہیں۔اب جب کہ نماز نے مستشرق موصوف کا راستہ روکا تو انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی تھیوری کو موڈیفائی کریں انہوں نے ایک نئی تھیوری ایجاد کر لی کہ عہد نبوی میں نماز کا وجود ہی نہیں تھا یہ تو مسلمانوں کے تطور زمانی کا نتیجہ ہے۔(۲۳)

ونسنک اسلام دشمنی میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ قرآن سے ثابت شدہ احکام کا بھی لحاظ نہیں رکھتے،قرآن مجید میں متعدد مقامات پر نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور ایسا ناممکن ہے کہ شارح ومبین قرآن نماز کے طریقے کو مبہم چھوڑ گئے ہوں اور پھر نماز عہد نبوی میں جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی تھی اور اس کے لیے اذان بھی پہلی یا دوسری ہجری میں مشروع ہوگئی تھی جس کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے(یا ایھا الذین امنوا إذا نودی للصلاۃ....الخ)اور شہادت اذان کا بھی جز ہے اور جب یہ بات مسلمات میں سے ہے تو ونسنک کی پوری تحقیق کی بنیاد ہی ڈھہ جاتی ہے،الا یہ کہ ونسنک یہ بھی دعویٰ کریں کہ اذان کا طریقہ بھی مسلمانوں نے عہد صحابہ میں نصاری سے اخذ کیا؟؟؟

چہارم:شاخت نے اپنی بات کی وضاحت کے لئے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ مشہور تابعی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے میں عقائد سے متعلق کوئی بھی حدیث موجود نہیں تھی جو اس بات کی دلیل ہے کی اس وقت تک عقائد سے متعلق احادیث (dogmatic tradition) کا وجود نہیں تھا لہذا عقائد سے متعلق احادیث اس رسالے کے بعد یعنی حسن بصری کے بعد وجود میں آئیں،ان کے الفاظ ہیں۔

There is no tradition in their treatise ascribed to

Hasan basari so dogmatic tradition is later than Hasan basari. (25)

شاخت کے اس اعتراض پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

his statement would be valid if it could be proved that:1-Hasan basri was the actual author of the work. 2-He can not ignorant of any tradition.(26)

یعنی شاخت کا اعتراض درست ہوسکتا ہے جبکہ:

1۔ مذکورۃ الصدر رسالے کی نسبت حسن بصری کی طرف صحیح اور یقینی ہو۔

2۔تمام ذخیرہ احادیث حسن بصری کے دائرے علم میں ہو۔

رہی رسالے کی حسن بصری کی طرف نسبت تو معترض یعنی شاخت کا خود یہ خیال ہے کہ اس کی نسبت حسن بصری کی طرف صحیح نہیں ہے،اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد ان کے اعتراض کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے، چنانچہ اس ضمن میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی صاحب شاخت کا تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

When the authenticity of the work is challenged and himself does not accept it as the work of Hasan, then what reason does he have for his hypothesis? it might have been written by a member of ahl Al-kalam or by any heretic or by anyone but how would the consequence involve Hasan basri and forgery of Hadith.(27)

''جب رسالے کی حقیقی نسبت متردد ہے،اور خود شاخت یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ یہ حسن بصری کا رسالہ ہے تو آخر کس بنیاد پر انہوں نے یہ مفروضہ تیار کیا ہے؟ اس لیے کہ ممکن ہے کہ اسکو اہل الکلام کے کسی فرد نے لکھا ہو، یا کسی بدعتی نے لکھا ہو یا کسی اور نے لکھا ہو۔''

شاخت کے اعتراض کے بجا ہونے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ حسن بصری کا دائرہ علم تمام احادیث کو محیط ہو، لیکن ایسا ہونا محال ہے، لہاذا بہت ممکن ہے کہ اس وقت حسن بصری تک عقائد سے متعلق احادیث نہ پہنچی ہوں البتہ دوسرے محدثین کے پاس وہ موجود ہوں، یا یہ بھی ممکن ہے کی انہوں نے جان بوجھ کر کسی وجہ سے ان احادیث کا تذکرہ اپنے رسالے میں نہ کیا ہو، کسی حدیث کا حسن بصری کے رسالے میں موجود نہ ہونا ہرگز اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس حدیث کا وجود ہی نہیں تھا، لہاذا

عقائد سے متعلق احادیث کو لے کر شاخت کا اعتراض بجا نہیں۔

پنجم: شاخت نے وضع حدیث کے اثبات کے تحت ایک دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ امام مالک اور اصحاب صحاح ستہ کے مابین وقفہ میں بھی جزوی وکلی طور پر احادیث وضع کی گئیں، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> ‘‘Malik adds to the text of a tradition from the prophet his own definition of the aleatory contract mulamasa ….)end(the same definition appears as a statement of Malik but his interpretation has become part of words of the prophet in Bukhari and Muslim.(28)

> ’’امام مالک نے ایک حدیث میں وارد ملامسہ کی تشریح اپنے الفاظ میں کی تھی لیکن توضیح آگے چل کر بخاری ومسلم میں حدیث کا جزو بن گئی۔‘‘

اول یہ کہ شاخت کا یہ کہنا کہ آگے چل کر ان کی تفسیر حدیث رسول کا جزو بن گئی ان کے علم کی سطحیت کی عکاسی کرتا ہے اور وہ اس لئے کہ شناخت اچھی طرح جانتا ہے کہ محدثین اس طرح کے discrepancy سے بخوبی واقف تھے ,اصول حدیث کی ہر کتاب میں ادراج یا مندرج کی فصلیں باندھی جاتی ہے جس میں اس طرح کے مباحث زیر بحث ہوتے ہیں محدثین نے نہایت باریک بینی کے ساتھ احادیث میں درآئے مدرجات کو واضح کیا ہے، نیز کبھی بھی انھوں نے ان مدرجات کو احادیث کا جزو نہیں مانا۔(۲۹) اب جبکہ محدثین نے انہیں احادیث کا جزو ماننے سے انکار کر دیا تو شاخت کا ان کو حدیث کا جزو مان کر اعتراض کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

مستشرقین نے حدیث پر جو بھی اعتراضات کیے ہیں، اور جتنے بھی دلائل دیے ہیں، پہلی نظر میں تو وہ تحقیق پر مبنی نظر آتے ہیں، لیکن اگر ذرا بھی غور وفکر کیا جائے تو انکی کوئی حیثیت نظر نہیں آتی، لہاذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کے شکوک اور وسوسوں سے متاثر نہ ہوں، اور اس کے لیے سب سے ضروری یہ ہے کہ ہم علم حاصل کریں اور وہ بھی پختہ علم۔

مراجع ومصادر

(1) Muslim Studies, vol 2 P.18

(2) The Origin of Muhammad Jurisprudence. P.149

(3) The tradition of Islam. P. 15

(4) Islam, Muhammad and his religion. P. 12
(5) The age of Faith. P.211
(6) The encyclopaedia Americana,Clolier.vol 15, P. 15/496
(7) السنۃ ومکانتہا فی التشریع الإسلامی . السباعی . ص196
(8) Islam, the way of life. P. 42
(9) The life and time of Muhammad. P. 359
(10) The Bible, The Quran and Science. P. 259..
(11) Ibid. P. 166 to 169
(12) السنۃ ومکانتہا فی التشریع الإسلامی . ص199
(13) حوالۂ سابق،ص203
(14) حوالۂ سابق،ص205
(15) حوالۂ سابق،ص200
(16) حوالۂ سابق،ص200
(17) A.G. The tradition of Islam. P.78
(18) Ibid. P. 169.G.Z.
(19) اسلام اور مستشرقین۔حافظ زبیر صاحب۔ص100
(20) مصدر سابق
(21) Muslim creed. P. 32. Wensinck.
(22) مصدر سابق
(23) M.M.Azmi. Studies in early hadith literature. P. 267
(24) حدیث اور علوم حدیث،ایک مختصر تعارف۔انیس احمد مدنی۔ص182
(25) 141J.S. Origin p.
(26) M.M.Azmi. Studies in early hadith literature. P. 255
(27) SeeAlso. P. 256
(28) Origin. P. 144 J.S.
(29) دراسات فی الحدیث النبویۃ وتاریخ تدوینہ . ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی . ص454

حدیث پر اعتراض کرنے والے مشہور مستشرقین

سعد شمس

۱- ڈی ہربلوٹ(De Herbelot)

سب سے پہلے سترہویں صدی کے آغاز میں فرانس کے رہنے والے ڈی ہربلوٹ (۱۶۲۵-۱۶۹۵) نے مشرق سے متعلق اپنے انسائیکلو پیڈیا، المکتبۃ الشرقیۃ، میں حدیث کے تعلق سے ایک باب مختص کیا ہے۔ یہ انسائیکلو پیڈیا ۱۷۳۸ء میں شائع ہوا ہے۔

ڈی ہربلوٹ پیرس میں پیدا ہوئے اور انھوں نے یونیورسٹی آف پیرس میں تعلیم حاصل کی اور مشرقی زبانوں کے مطالعہ کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اٹلی جا کر ان کے ساتھ بات چیت کر کے اپنے آپ کو کامل بنانے کے لیے اٹلی گئے۔ وہاں اس نے ہاسٹینٹس ،ڈی ہومٹ (۱۵۹۶-۱۶۶۱) اور یونانی اسکالر لیوالا تہاس (۱۵۸۶-۱۶۶۹) سے بھی جان کاری حاصل کی۔

کچھ سال بعد وہ پھر اٹلی کے دورہ پر گیا، جب ٹسکنی کے گرینڈ ڈیوک فرڈ پینڈ دوم نے انہیں بڑی تعداد میں اورینٹل مخطوطات پیش کیا اور اسے اپنے دربار سے منسلک کرنے کی کوشش کی۔ ۱۶۹۲ میں انھوں نے جیکسن اور ڈا اور کنس کے بعد سرائیک (Syriac) کی کرسی پر بیٹھے۔ ۸/دسمبر ۱۶۹۵ کو پیرس میں ان کا انتقال ہوا۔

ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ ”کتب ستہ موطا، سنن الدارمی، سنن الدار قطنی، سنن البیہقی اور علامہ سیوطی کی کتابوں میں موجود احادیث زیادہ تر تالمود سے ماخوذ ہیں۔ نیز انھوں نے ان احادیث جن کی تطبیق اور ان پر عمل کا مسلمانوں نے التزام کیا ہے اور مجرد تاریخی روایات و احادیث کے درمیان فرق کرنے بھی کوشش کی ہے۔ نیز ان کا خیال ہے کہ دین اسلام اصلاً یہودیت اور جزیرۃ العرب میں موجود دیگر مذاہب و ادیان سے ماخوذ ہے۔“

۲- پروفیسر اجناس گولڈزیہر

زیہر کی ولادت ہنگری کے ایک شہر Szikesfecervar میں ۲۲/جون ۱۸۵۰ء کو ہوئی۔ لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا ذوق فطری تھا۔ اس لیے ابھی عمر پانچ برس کی تھی کہ عہد نامہ عتیق کے عبرانی اڈیشن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ آٹھ برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، اسی کا نتیجہ تھا کہ بارہ برس کی عمر میں گولڈزیہر نے عبرانی زبان میں جو مناجاتیں ہیں ان کی اصل اور ان کے اقسام پر ایک مقالہ لکھا اور اسے شائع کرایا۔ ابھی عمر سولہ برس کی تھی اور وہ اسکول بوائے ہی کہلاتے تھے کہ گولڈزیہر نے فلسفہ او رقدیم زبانوں میں مثلاً فارسی اور ترکی کی کلاسوں میں جو بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوئی تھیں۔ پابندی اور باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی۔ اس کی تکمیل کر لینے کے بعد گولڈزیہر کو مزید اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کی طرف سے ایک وظیفہ مل گیا تو اب وہ جرمنی چلے آئے اور برگ اور برلن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ جرمنی سے وہ ہالینڈ گئے اور لیڈن میں جو اس زمانے میں اسلامیات کے درس اور مطالعہ کا یورپ میں سب سے بڑا مرکز تھا، چھ مہینے قیام کیا۔ اس قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولڈزیہر نے اب تک جو کام کیا تھا اگر چہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا، لیکن اس کا تعلق زیادہ تر یہودی اور اسامی زبانوں (جن میں عربی بھی شامل تھی) کے ادب ولٹریچر کے مطالعہ سے تھا۔ مگر اب یعنی لیڈن میں قیام اور اسلامیات کے درس اور مطالعہ کے بعد جیسا کہ گولڈزیہر نے خود اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے۔ اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق اور ریسرچ ان کی علمی زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا۔

اس سلسلے میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور ستمبر ۱۸۷۳ء سے اپریل ۱۸۷۴ تک دمشق اور قاہرہ میں قیام کیا۔ جامعہ ازہر قاہرہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ قانوناً ممنوع تھا لیکن گولڈزیہر نے خصوصی اجازت حاصل کر کے اس میں داخلہ لے لیا اور بحیثیت طالب علم وہاں پڑھنا شروع کر دیا۔ گولڈزیہر نے جو زمانہ یہاں گزرا اس کو انھوں نے اپنی زندگی کی خوشگوار ترین اور مفید ترین مدت بیان کیا ہے۔

جب ۱۸۷۴ء میں ڈائنا کی امپیریل اکاڈمی کی روداد میں گولڈزیہر کے علمی کارنامہ کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ اور خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں اور یہی واقعہ ان کی شہرت کا سبب بنا۔

اس کے بعد گولڈزیہر کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ ۳۰ برس (۱۸۷۶ سے ۱۹۰۴) گولڈزیہر نے یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا، لیکن یہ کام ان کی طبیعت اور مزاج و مذاق کے خلاف تھا۔ لہٰذا اس میں مصروفیت کے باوجود شام کے اوقات، تعطیل کے ایام اور ہفتہ وار چھٹی کے دن، جو وقت ملتا گولڈزیہر اسے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف کرتے۔ ان کی عظمت اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا اور ۱۹۰۴ میں انھوں نے پہلی مرتبہ ان کا تقرر ایک با قاعدہ باضابطہ اور باتنخواہ پروفیسر کی حیثیت سے لوڈ ایسٹ یونیورسٹی میں ہوا۔ ۱۹۱۴ سے فیکلٹی آف لا کے تحت اسلامی فقہ کے صدر شعبہ ہو گئے۔ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۱ کو ان کا انتقال ہوا۔

مشہور تصانیف:

(1) Muslim Studies
(2) Muhammedani Studies
(3) Muhammad and Islam

جوزف شاخت(Josef shacht)

جوزف شاخت (۱۹۰۲-۱۹۶۹) جرمن و برطانوی مستشرق ہیں۔ وہ ایک کیتھولک فیملی میں پیدا ہوئے اور جرمنی میں ہی اس نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے اساتذہ میں کاٹ ہیلف کا نام ملتا ہے۔ وہ آکسفورڈ، لیڈان اور کولمبیا یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر رہے ہیں۔ اہلِ مغرب میں حدیث اور فقہ اسلامی میں اختصاص کی وجہ سے معروف ہے۔ حدیث کے بارے میں انھوں نے اپنا نقطہ نظر اپنی کتاب ''محمد فقہ کے مصادر Origins of Muhammaden Jurisprudence میں پیش کیا ہے، جو ۱۹۵۰ میں شائع ہوئی۔ یہ اسلامی قانون سے متعلق مغربی اسکالر کا ممتاز مالک تھا۔

کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے جوزف کے اندر مطالعہ کا شوق غایت درجہ کا تھا۔ اسی لیے وہ ابتدائی عمر میں ہی عبرانی اسکول میں طالب علم بن گئے تھے۔ برسیلا ؤ اور لیپزگ میں اس نے گوتھیلف ہرگسٹر، رسمبت پروفیسر کے تحت سامی، یونانی اور لاطینی زبان کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۲۵ میں اس نے اپنی پہلی تعلیمی پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۲۷ میں وہاں پر ایک غیر معمولی پروفیسر بن گئے۔ ۱۹۳۹ میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر جو انگلینڈ میں ہوا جہاں انھوں نے برطانوی حکومت کو اپنی خدمات پیش کیں اور بی بی

سی کے لیے کام کیا۔ ۱۹۴۷ میں وہ ایک برطانوی شہری بن گئے۔

شاخت نے ۱۹۴۶ سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھایا۔ ۱۹۵۴ میں وہ نیدرلینڈ چلے گئے۔ ۱۹۵۹ میں وہ عربی اور اسلامی علوم کے مکمل پروفیسر بن گئے۔ ۱۹۶۹ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ (۲،۱)

شاخت حدیث کے بارے میں اپنے پیش رو گولڈزیہر سے متاثر ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس کی کتاب کا اصل مقصود گولڈزیہر کے نقطۂ نظر کو تقویت دینا اور قانونی اور فقہی احادیث کا ماخذ امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانے کے بعد ثابت کرنا ہے۔

شاخت کا کہنا یہ ہے کہ احادیث کی کتب میں فقہی مسائل سے متعلق جو روایات ہمیں ملتی ہیں وہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعیؒ کے زمانے کے بعد گھڑی گئیں۔

> The aim of part II is to show that a considerable unmber of legal traditions which appear in the classical collections, Qriginateel after Malik and shafeid (3)

شاخت کا خیال ہے کہ پیغمبر اسلام کے قانون کا آغاز بنی امیہ (661-750) کے آخر دور میں ہوا۔ اس کے الفاظ ہیں۔

> In any case, it is safe to revy that muhammadan legal scince stated in the later part of the Umayyad peried taking th legal practise of the time as its raw material and endorring, modifying or rejecting it.(4)

مشہور تصانیف:

1. The origin of Muhammaden Jurisprudance.
2. An Intracuction of Islamic Law

۴- نابیہ ایبٹ (Nabia Abbot)

نابیہ ایبٹ امریکن مستشرق ہیں جو یونیورسٹی آف شگاگو میں مشرقی علوم کی پہلی پروفیسر تھیں وہ ۱۸۹۷ میں ترکی میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ایک تاجر تھے۔ لہٰذا وہ اپنے والد کے ساتھ کچھ عرصہ عراق اور پھر انڈیا میں رہیں جہاں انھوں نے لکھنؤ سے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ (۵)

فارغ التحصیل ہونے کے بعد نابیہ مختصر وقت کے لیے میسو پوٹیمیا واپس آ گئی، انھوں نے وہاں کی خواتین کے لیے تعلیم میں کام کیا۔ سیرت عائشہ پر ان کی کتاب Aisha the beloved of Muhammad کے نام سے شائع ہوئی۔

۱۹۲۳ میں نابیہ ایبٹ اپنے کنبے کے ساتھ امریکہ چلی گئیں جہاں انھوں نے بوسٹن یونیورسٹی سے ۱۹۲۵ میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی پھر ۱۹۲۵ سے ۱۹۳۳ تک انھوں نے یسبری کالج (Asbutoy Collaege) میں تاریخ کی تعلیم دی اور تاریخ کے شعبہ کی سربراہ بن گئی۔ ۱۹۳۳ میں وہ مارٹن اسٹر لیگنگ کے تحت ڈاکٹریٹ کی تعلیم شروع کرنے کے لیے شکاگو یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوگئیں۔ ۱۹۶۳ میں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پروفیسر (ایمپریٹر) بن گئیں۔ نابیہ ایبٹ کا انتقال ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۱ کو شکاگو میں ہوا۔ (۶،۷)

نابیہ ایبٹ نے شاخت اور گولڈ زیہر کے اس نقطۂ نظر کو نشانہ بنایا ہے کہ احادیث کے ایک معتد بہ ذخیرہ کی اسناد نظریہ ضرورت کے تحت وضع کی گئیں ہیں۔

ایبٹ کا کہنا یہ ہے کہ میں نے احادیث کے جن مخطوطات (Manuscripts) پر ریسرچ کیا ہے۔ اس کے مطابق احادیث زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے سے نسل در نسل نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں وضع کی گئیں۔ یہ بات غلط ہے۔ ایبٹ نے یہ بھی واضح کیا کہ یہ غلط فہمی احادیث کی اسناد کے میکانزم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایبٹ کے بقول احادیث کے متون (Texts) تو پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے سے نسل در نسل چلے آ رہے تھے۔ لیکن بعد کے زمانوں میں ان متون کو نقل کرنے والوں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے مختلف طبقات میں اسناد کی کثرت پیدا ہوگئی۔ (۸)

مشہور تصانیف:

1- Aisha the Beloved of Muhammad
2- Studies in Arabic
3- Two Queens of Baghdad.

حدیث پر اعتراض کرنے والے مشہور مستشرقین کے بارے میں لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم دشمنانِ اسلام کو پہچانیں اور ان سے ہم اپنے دین واسلام کو محفوظ رکھیں۔ دورِ حاضر میں ہماری ذمے داری یہ ہے

کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون کو مستشرقین کے افکار ونظریات سے ہٹ کر اس کے اصلی روپ اور خدوخال میں پیش کیا جائے۔ دوسروں کے علوم وفنون اور لغات کو سیکھ کر اسلامی علوم وفنون کے ان کے اسلوب اور ان کی زبانوں میں صحیح ترجمانی پیش کی جائے۔ مغرب کی طرح ہم بھی اہل مغرب کے افکار ونظریات، تہذیب وتمدن اور مذاہب کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ پیش کریں۔

مراجع ومصادر

1- Rainer Brunner (2005) "Schacht, Jusef Franx, Neue Deutshe biographic pp.491,492
2- Bernard Lewis (1970) Jaseph Schacht Bulletin of the School of orental and African Studis vol.33 part2. pp 378-381
3- Joseph schailt the ougin of Mauhammaden Jurisprudince.
4- The Origin of Muhammaden Juriprudence p.10
5- Mahdi Mohsin Fareword, Jourmal of Near Eastern Studies,40
6- Duda Dorathea (1990) Nabia Abbott.
7- Brinkman johd A. (1981) Introduction the oriental Institute Annual Keport.
8- اسلام اور مستشرقین، ڈاکٹر حافظ محمد زبیر، ص ۱۰۵

نصاب کا مقصد ذہنی تخلیق کا حصول ہو

ظفر احمد الاثری فلاحی

حیات نو کا خصوصی شمارہ ''مدارس اسلامیہ کی ہم نصابی سرگرمیاں'' نکال کر آپ تمام لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیاں یا غیر درسی سرگرمیاں خصوصی طور پر مدارس کے طلبہ کے لیے دوسروں مقابلے میں زیادہ ضرورت ہے۔ مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کے لیے اور بھی ضروری ہے۔ چونکہ ان کے نصاب سے ہٹ کر غیر درسی مواد کا مدارس کی طرف سے ایسا انتظام نہیں ہوتا کہ نصابی سر گرمیوں کو سمویا جا سکے۔ اس لیے صرف نصاب کے ذریعہ تخلیقی ذہن کی نشو ونما نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ غیر درسی سرگرمیوں کا بھر پور طریقہ کار نہ اپنایا جائے۔

نصاب کے ذریعہ ذہنی سمجھ بوجھ کے عمل میں تخلیق پیدا کرنے کا درجہ پیدا کرنا ایک مشکل عمل ہوتا ہے۔ تخلیقی ذہن پیدا کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعہ آزادنہ ذہن تیار ہو بلکہ دین و شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے عملی زندگی میں نئی نئی اختراعات پیدا کرنا، نئی سوچ کو جنم دینا ہے لیکن بعض وقت ہمارے یہاں اس سوچ اور سمجھ کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے لیکن تخلیقی سوچ کے ضمن میں دین کی حدود کو پار کرنا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

عام طور پر مدارس کا نصاب کتابی ہوتا ہے، یعنی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے اور کورس پورا یا جائے۔ اور مدارس عربیہ کے نصاب کی ایک بہت خامی یہ ہے چیزوں کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کا مواد ہوتا ہے، اور understanding (سمجھ اور تفہیم) کے جو مختلف طریقے ہو سکتے ہیں کم توجہ کے طالب ہوتے ہیں اس لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نصاب کے اندر ہم نصابی سر گرمیوں کو مختلف انداز سے سمویا جائے۔ ان کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں اور ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے یہاں نظریاتی چیزوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، تخلیقی ذہن (creativity) پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے۔نظری وفکری پختگی ضرو پیدا ہوتی ہے لیکن نظری وفکری مواد کو تخلیقی بنانے کے مواقع نہیں ملتے یا ایسی سرگرمیاں نہیں ہوتی ہیں جو اس بات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے کہ ایسا کیوں ہے، اور اسکی کیا وجہ ہے۔

کوئی ورکشاپ نہیں ہوتا کہ ان کی عملی تطبیق ہوسکے۔نصاب ایسا ہو کہ تخلیقی ذہن کو Empower (عملی تنفیذ اور تطبیق) کرنے کے ساتھ ساتھ ریسرچ کے راستہ میں ذہن کو ڈالا جا سکے دراصل تخلیقی ذہن کے بعد ہی ریسرچ کا راستہ نکلتا ہے۔اس کام کو کرنے کے لیے ایک منظّم طور پر نصاب کے اندر غیر درسی سرگرمیوں کو لاگو و نافذ کیا جانا چاہیے۔

اساتذہ کا رول اس سلسلہ میں بہت ہی اہم ہوتا ہے ایسے اساتذہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے جو نصابی مواد نافذ کرتے ہوئے فکری اور عملی تعلیم کے ساتھ طلبہ کے اندر تخلیقی ذہن بنانے کے لیے پوری صلاحیت رکھتے ہوں اور جو نصاب کو پڑھاتے ہوئے کما حقہ اس تخلیقی ذہن کو طلبہ کے اندر بیدار کرسکیں جو معیار مطلوب ہے۔مثال کے طور مولانا شہباز ہندی اصلاحیؒ اپنے دروس کے اندر کسی غیر درسی موضوع پر چھڑ جانے والی گفتگو پر بھر پور مباحثہ کرتے تھے اسلامیات کا کوئی موضوع ہو، سیاسیات پر کوئی گفتگو ہو یا زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کوئی مسئلہ ہو وہ اپنے دلائل سے طلبہ کو قائل کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے اور طلبہ کو پورا موقع دیتے تھے کہ وہ اپنی بات ان کے سامنے رکھ سکیں۔انکی تدریس کا طریقہ بہت ہی زیادہ تخلیقی ہوتا تھا، کوئی بھی مسئلہ ہو'' کیوں'' کا جواب ضرور ملتا تھا، طلبہ ان سے اختلاف کا پورا حق رکھتے تھے اور وہ انکی باتوں کو سنتے تھے۔عام طور سے مدارس میں کلاس کے اندر'' کتابی دنیا'' سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی دراصل انکے اندر اس بات کی بہترین صلاحیت تھی کہ طلبہ کو مکمل طور پر سوچنے اور سمجھنے کے راستے پر رہنمائی کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔انکے پاس دلائل کی بھر مار ہوتی تھی ان کا ذہن اللہ نے بہت ہی '' طَبّاع'' صفت بنایا تھا۔کسی چیز کو ثابت کرنے میں کسی وقت بھی دشواری نہیں پیش آتی تھی۔مولانا جلیل احسن ندویؒ اس اسلوب تدریس سے بالکل مختلف تھے ان کے یہاں قرآن کے دروس اور عربی کے دروس کو پڑھانے کا اسلوب اس طرح ہوتا کہ طلبہ کے ذہن میں اتر جاتا اور اس طرح ذہین نشین ہوتا تھا کہ کبھی بھی بھولنے کا نام نہیں ہوتا ۔دروس کے دوران

الفاظ کی تحقیق کرواتے ،درس کے دوران مختلف مفسرین کی تفاسیر سے استفادہ کرتے اور پسندیدہ ترجمہ کی طرف نشاندہی کرتے تھے،ان کا کمرہ کلاس روم بھی تھا جہاں انکی لائبریری بھی تھی جس میں مختلف کے معاجم تھے،مختلف قسم کی تفاسیر تھیں درس کے دوران ان میں جس کی ضرورت ہوتی فوراًانکی طرف رجوع کرلیا جاتا اسی طرح الفاظ کی تحقیق میں مختلف قسم کے لغات کی طرف رجوع کرتے ،ضرورت پڑتی تو پیشگی مشکل آیتوں کا پس منظر کے بارے میں نوٹ لکھوا دیتے تھے۔، درس کے دوران طالبعلمانہ سوالات کر کے مسائل کو حل کرتے تھے۔نحوی تراکیب کی طرف توجہ دیتے تھے، وہ اسباق کا غایت درجہ مطالعہ کر کے آتے تھے ادب کا درس ہو یا قرآن کا بغیر مطالعہ کے درس نہ دیتے تھے۔،ادب کی کتابوں میں بعض مشکل عبارتوں پر اعراب بھی لگواتے ۔اس طریقہ تدریس سے طلبہ کا ذہن مطمئن ہوتا اور تدریس کا یہ اسلوب طلبہ کے اندر تحقیق کا جذبہ پیدا ہوتا اور روزانہ کا سبق اس انداز سے حاصل ہوتا کہ طلبہ کل کے سبق کے منتظر ہوتے تھے۔عربی ادب بھی اسی تحقیق کے ساتھ پڑھاتے تھے،کوئی بھی کتاب ہو منثورات ، مختارات ،حماسہ اور جمھرۃ اشعار العرب سب کے اسباق کو پڑھانے سے پہلے ضرور اس بات کی نشاندہی کر دیتے تھے کل کا سبق کس طرح کا ہے اور اس میں کیا کیا مشکلات ہیں اگر وہ یہ سمجھتے کہ طلبہ کے لیے اس میں کسی مدد کی ضرورت ہے تو اسکی طرف اشارہ کرتے دیتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات منثورات اور اور مختارات کی طباعت کی غلطیاں درست کروا دیتے تھے اور حوالہ جات کی تصحیح فرما دیا کر دیتے تھے۔الفاظ کی تحقیق تو انکا شیوہ تھا انکی تشریح کے بغیر کوئی درس خالی نہیں ہوتا تھا۔تدریس کا یہ فن ذہن کو بالیدگی اور پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق اور جستجو کی راہیں استوار کرتا تھا اور یہیں سے طلبہ کا ایک تخلیقی ذہن بنتا تھا۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کا اسلوب یہ ہوتا تھا کہ وہ طلبہ کو مطالعہ پر زور دیتے تھے اور مطالعہ کے بغیر درس دینا اور سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور درس کو ڈکشری کے ذریعہ حل کر کے لانے کی تلقین کرتے تھے اور درس سے پہلے کسی تفسیر کا مطالعہ بھی ممنوع تھا، یہ بات تو تمام اساتذہ کے یہاں قدر مشترک تھی کہ طلبہ مطالعہ کے بغیر کلاس میں نہ آئیں لیکن اس منہج کو نافذ کرنے کے لیے ہر استاذ کا اپنا اپنا انداز اور اسلوب ہوتا تھا۔تمام کے یہاں کے یہ لازم ہوتا تھا ایک ہوم ورک کے طور پر درس کے معانی ڈکشری کے ذریعہ اپنی استطاعت بھر ضرور حل کر کے لائیں اور اس کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ طلبہ کی تحقیق و

جستجو کی صلاحیت کی نشوؤ ونما ہو سکے اور انکی خوابیدہ صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں اور یہ طریقہ تدریس انھوں نے اپنے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے کسب کیا اور اس طریقہ درس کو بار بار اپنے درس کے دوران ذکر کرتے تھے۔اوراسی منہج پر استاذ محترم زور دیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ ایک دوسرا اسلوب اس پس نظر میں یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ خارجی مطالعہ پر بہت زور دیتے تھے درس کے اندر موضوع سے متعلق مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی کتابوں کا حوالہ دیتے تھے بلکہ بعض اوقات تو کتابوں کا حولہ لیکر آتے اور اسے پڑھ کر سناتے تھے۔اس ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کتابوں کا بھی حوالہ دیتے ۔مولانا جلیل احسن ندویؒ کے یہاں یہ ہوتا تھا کہ وہ تمام تفاسیر کا حوالہ دیکر گفتگو کرتے تھے انکی ترجیحات میں کسی خاص مفسر کی رائے نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک کھلے ذہن کے ساتھ طلبہ پر چھوڑ دیتے کہ وہ کسی بھی رائے کا انتخاب کرلیں۔مزید مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے یہ نمایاں خصوصیت تھی بہت اعلی مصنفین کی کتابوں کو پڑھنے کے لیے کہتے تھے جن میں دارالمصنفین کی کتابیں جیسے علامہ شبلیؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ نام شامل تھے بلکہ بعض اوقات تو بعض ایسے اقتباسات جو اردو ادب کے شہ پارے تھے انکو پڑھ کر سناتے تھے ظاہر یہ اسلوب طلبہ کے لیے انتھائی مفید ہوتا تھا اور ذہن کو اس رخ پر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے کہ معیاری کتابیں پڑھ کر ایک تخلیقی ذہن کی پرورش ہو سکے اتنا ہی نہیں بلکہ وہ عربی ادب میں لکھنے اور بولنے پر بہت زور دیتے تھے اور خود بھی کلاسوں میں عربی بولتے تھے اور اسکی طرف ہمت افزائی کرتے تھے۔ایک وقت وہ بھی تھا اساتذہ پر لازم کر رہے تھے کہ ادب اور انشاء کی گھنٹیوں میں عربی زبان میں گفتگو کریں۔دراصل امام فراہیؒ کے تیار کردہ نصاب کے اندر تخلیقی ذہن پیدا کرنے کے بہت سارے عناصر ہیں جن کا استعمال اس فکر کے حامل اساتذہ استعمال کرتے ہیں اور یہی خوبی ہے اسی نصاب کی ہے چونکہ اس نصاب کی تنفیذ کے طریقہ کار ہی میں ایسا عنصر موجود ہتا ہے کہ وہ طلبہ کی تفہیم کے ساتھ ساتھ تخلیقی ذہن کی نشو ونما کی طرف لے جاتا ہے اور طالب کا ذہن اسکی طرف مائل ہوتا ہے۔

عام دینی مدارس میں تمرینات کا خیال نہیں رکھا جانا جسکی وجہ سے creativity (تخلیقی) ذہن تیار نہیں ہوتا ہے۔ایسا نہیں کہ مدارس تخلیقی ذہن بنانے میں یکسرت ناکام ہیں البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اسکی اہمیت کی طرف توجہ بہت کم ہے،سب ہی کے یہاں نصاب کی تکمیل میں ایسا طریقہ کار ضرور ہوتا ہے کہ ذہن کو تحقیق وجستجو کی طرف لگائیں لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر اس

کی طرف کم توجہ ہوتی ہے اوراس کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہے بلکہ اسے ایک ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے تدریس کا یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ قرآن کو براہ راست سمجھا جائے اور درس میں جانے سے پہلے براہ راست اس کا مطالعہ کیا جائے اوراسے تفسیروں سے نہ سمجھا جائے۔ اسکی بنیاد بھی مولانا فراہیؒ کے یہاں یہی ہے کہ قرآن پر تدبر وتفکر کیا جائے تواس کے ذریعہ ہی قرآن کے نظم کو بخوبی حاصل کیا جاسکتا ہے اور قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے۔ گویا تدبر وتفکر قرآن کو سمجھنے کے لیے کلید ہے، یہ طریقہ تدریس دراصل طلبہ کے اندر تخلیقی ذہن پیدا کرنے کا اولین ذریعہ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا نصاب اوراس کے implement (تنفیذ کا طریقہ کار) کا پروسس ایک منھج ہے جو طلبہ کے اندر مطالعہ کی قوت کو بڑھاتا ہے اوران کے اندر understanding (سمجھ اور تفہیم) کی قوت کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ ذہن کو تخلیقی بناتا ہے اور یہ راستہ ریسرچ کی طرف لے جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عربی سیکھنے کا طریقہ کار بھی صرف اتنا نہیں ہے کہ اسباق کو یاد کرلیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان اسباق کی مشقیں ہوتی ہیں۔ ان سے اسباق ذہن نشین ہوتے ہیں اوران سے سمجھداری کی قوت میں اضافہ ہوگا۔ اور یہی طریقہ ذہنی تخلیقی کے راستوں کو ہموار کرتا ہے ورنہ صرف کتاب پڑھادی اوراسکی تمرینات کی سرگرمیاں نہ کی جائیں تو طلبہ کا ذہن کیونکر تخلیقی ہوگا۔

یہی حال عربی ادب کے دروس کا ہے انھیں پڑھانے ساتھ ساتھ انشاء پردازی کے ذریعہ عربی سمجھنے اور لکھنے کی مشقیں ہوتی ہیں۔ جامعہ کا نصاب بھی اسی تخلیقی ذہن کی تیاری کے لیے بنایا گیا ہے۔ یوں تو یہ بات متعین نہیں کی جاسکتی ہے کہ طلبہ کے نصاب کے ذریعہ کس اسلوب اور کس منھج کو اختیار کرکے ذہن کو تخلیقی بنایا جاسکتا ہے اس کا تعین وقت اور حالات کے لحاظ سے کیا جاسکتا ہے، ہر اسکول آف تھاٹ کے طریقہ کار میں اختلاف ہوسکتا ہے اور کتاب وحدیث کے نصاب میں کونسا بہتر اور فعال طریقہ ہوسکتا ہے کہ طلبہ کے تخلیقی ذہن پیدا کیا جائے ہر مدرسہ کا اپنا اپنا طریقہ کار ہوسکتا ہے۔ اپنے ہی نصاب کے اندر رہتے ہوئے تخلیقی ذہن کو پیدا کرنے میں کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے زمانہ میں یہ کام اور بہتر سے بہتر طریقہ سے کیا جاسکتا ہے اوران کے ٹکنیکس استعمال کرکے تخلیقی ذہن پیدا کرنے میں اس مقصد کے حصول میں ایک نمایاں ترقی ہوسکتی ہے مغرب میں curriculum (نصاب) کو تنفیذ کرنے میں ان ٹکنیکس کو استعمال کیا جاتا ہے جو ابتدائی

عمر کی تعلیم سے لیکر تعلیم کے آخری مرحلے تک روبہ عمل رہتا ہے اور طلبہ کو پڑھانے کا اسلوب تخلیقی ہوتا ہے، اور ریسرچ کا اسلوب بھی اپناتے ہیں اور جدید طور پر کریکلم کو سال بہ سال ترقی دیتے ہیں اور تخلیقی اسلوب کو نصاب کے اندر اس طرح جگہ دی ہے کہ جدید ٹیکنیک کو استعمال کر کے نت نئے ایجادات کرتے رہتے ہیں اور یہ تسلسل کبھی نہیں رکتا۔ اور انکے تخلیقی عمل میں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوتا۔ انکی یونیورسیٹیز کے تعلیمی نصاب میں ریسرچ کا عمل ہر وقت روبہ عمل ہوتا ہے اور جو یونیورسیٹیز اپنے ریسرچ میں جس قدر آگے ہوتی ہیں اسی اعتبار سے ranking (درجہ بندی) انکی اونچی ہوتی ہے۔ وہ اپنے نصاب میں تخلیقی قوت کو کھیل کود کو ذریعہ بناتے ہیں اور انکے نصاب کا حصہ ہوتا ہے۔ کمپیوٹر سائنس کی ایجاد نے تعلیمی میدان میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے اور ماہرین تعلیم نے اسے ایک ذریعہ تعلیم بنا کر طلبہ کی تعلیم وترقی اور انکی ذہنی نشو ونما میں ایک عظیم الشان رول ادا کیا ہے۔

آپ کے خصوصی نمبر میں ہم نصابی سرگرمیوں کا ذکر نظری اور عملی دونوں موضوعات کا امتزاج ہے یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ اس پرچے کے مخاطب طلبہ اور اساتذہ ہیں اس لئے عملی اور تطبیقی اور تجربات سے بھرے مضامین طلباء کے لیے بہت مفید ہونگے اور یہ تصویر اس خاص نمبر میں بہت ہے اس سے طلبہ مستفیض ہونگے اور کہیں نہ کہیں سے وہ اپنے کو اس آئینہ میں دیکھیں گے اور ان کے اندر ضرور حوصلہ اور امنگ کے جذبات ابھریں گے ان شاء اللہ۔ آپ لوگوں کی کوشش بارآور ثابت ہوگی۔ اللہ تعالی آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے آمین۔ اسی انداز سے جو آپ نے ایک مشعل راہ دکھلائی ہے اسی نھج پر جامعہ کی تعلیم وتربیت کے علاوہ تدریس کی عملی کوششوں کو اجاگر کیا جائے جو اساتذہ مختلف فنون پر مہارت رکھتے ہیں انکے تدریسی تجربات کو جمع کیا جائے، اس پر آپ بخوبی سوچ سکتے ہیں اور آپ تعلیمی میدان میں ہیں بہتر خاکہ تیار کر سکتے ہیں کہ کیسے طلبہ کے اندر سوچ وفکر کے ساتھ عملی اور تطبیقی اسپرٹ کو ڈیولپ کیا جائے۔

اشاعت خاص: ایک جائزہ، ایک تبصرہ

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

جامعۃ الفلاح بلریا گنج (اعظم گڑھ) کا شمار ہندوستان کی ان عظیم دینی درس گاہوں میں ہوتا ہے جس نے اپنی عظیم خدمات کے ذریعہ ان علماء وفضلاء کی ایک معتد بہ جماعت تیار کی جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے علمی وعملی کارہائے نمایاں سے اپنا اور ادارے کا نام روشن کیا۔

ماہنامہ ''حیاتِ نو'' جامعۃ الفلاح کی انجمن طلبۂ قدیم کا علمی ترجمان ہے جس کے مدیر مسئول سید راشد حامدی اور مدیر اعزازی ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی ہیں۔ اول الذکر دہلی میں رہائش پذیر ہیں جب کہ موخر الذکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شعبہ کی علمی، تحریکی، قلمی وتحریری سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا موصوف کا خاصہ ہے۔ نت نئے موضوعات پر نگارشات کا جال پھیلانا ضیاء الدین صاحب کی طبیعتِ ثانیہ ہے۔ غالبًا اسی کا نتیجہ ہے کہ تازہ ترین شمارے (اگست-ستمبر ۲۰۱۹ء) کو ''مدارس اسلامیہ کی ہم نصابی سرگرمیاں'' سے معنون کیا گیا۔

الحمدللہ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناگفتہ بہ حالات کے نتیجہ میں جن مدارس نے اپنے اپنے طریقوں کے مطابق علم دین کی اشاعت وتبلیغ کو فرض جانتے ہوئے تحریکی شکل میں قریہ قریہ پھیلایا ان میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور کے ساتھ ساتھ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج اُن اداروں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ مذکورہ اولین دو اداروں کو فقہی مسالک میں اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔ لکھنؤ کو عربی ادب کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے۔ مبارکپور کا مدرسہ اہل سنت والجماعت کا ترجمان شمار ہوتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کا اختصاص قرآن فہمی ہے جب کہ آخر

الذکرادارہ ہمہ جہتی علمی خدمات کا آئینہ دار مانا جاتا ہے۔لیکن سب کی بنیاد مذہب اسلام کی خدمت ہے اور مناسب ترین انداز سے اپنے منہج فکر کی تبلیغ واشاعت ہے۔سادہ لوح افراد کے ساتھ یہ مسئلہ ضرور رہا ہے کہ انھوں نے اپنے منہج کو صد فیصد درست مانتے ہوئے دوسرے مزاج کے افراد تو کجا علماء تک کو در کنار کرنا اپنا ملی فریضہ جانا جس کے نتیجے میں مناظروں، مجادلوں، مباحثوں کے دروازے کھلے اور ملت مختلف خانوں میں تقسیم ہوگئی جو فی الحقیقت پوری ملت کی رسوائی کا باعث بنی، لیکن وقت کے بدلتے تیوروں اور لازمی تقاضوں نے اس حقیقت کو سمجھنے پر مجبور کردیا کہ اگر ہم نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں ترک نہ کیں تو وہ دن دور نہیں کہ جب ؎

''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''

اس اشارتی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر موجودہ شمارے کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔اداریہ، جامعہ کے لیل ونہار اور اخبار انجمن، لازمی مضامین کے علاوہ یہ شمارہ ایک درجن عنوانات میں منقسم ہے جن کے لکھنے والوں میں مولانا ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب، پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی صاحب، پروفیسر توقیر عالم فلاحی صاحب جیسے مشاہیر اسلامیات ودینیات بھی ہیں جس سے اس شمارے کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔اگرچہ بیشتر مضامین کا تعلق دینی مدارس کی تعلیم، تربیت، نصاب اور ہم نصابی سرگرمیوں سے ہے۔

دینی مدارس میں تعلیم وتدریس بیشتر درسی کتابوں تک ہی محدود ہے جس کی وجہ سے عرفِ عام میں ان اداروں کے تجدیدی رویے پر تنقید کی جاتی ہے۔البتہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اپنے قیام کے روزِ اول سے ہی تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے طلبہ کی غیر تدریسی سرگرمیوں کے لیے بھی اپنے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے، جس کی بنا پر اسے امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی۔انھیں سرگرمیوں کا جائزہ لینے اور انھیں قارئین تک پہنچانے کے لیے یہ شمارہ دستاویزی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔

اداریے میں مدیر اعزازی نے تحریکِ اسلامی کے ماہر تعلیم اور فنِ تعلیم وتربیت کے مصنف کی غیر تدریسی مصروفیات کا جائزہ لیتے ہوئے اس شمارے کو غیر تدریسی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ طالب علم کی شخصیت کو کارآمد بنانے کے لیے مدارس میں رائج ناقص تربیتی نظام کی اصلاح اور عصری دانش گاہوں میں اس موضوع کو توجہ کا مرکز بنانے کو قرار دیا ہے۔ہمارے خیالِ ناقص میں اس سلسلے میں

مدیر اعزازی کو اپنے الفاظ پر نظر ثانی ضرور کرنی چاہیے کیوں کہ اگر ''مدارس میں رائج تربیتی نظام'' 'ناقص' ہے تو اس کے نتیجے میں کم از کم گزشتہ چند دہائیوں میں فضلائے مدارس کی وہ ''کہکشاں'' کس طرح وجود میں آ گئی جس میں موصوف بذاتِ خود بھی شامل ہیں۔

تربیتی نظام ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کا خواہاں ضرور رہا ہے لیکن اس کے لیے اسے ''ناقص'' کہنا علمی دیانت داری سے میل نہیں کھاتا۔ اس لیے اس پر نظر ثانی کر لی جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔

''دینی مدارس میں ہم نصابی سرگرمیوں کی ضرورت'' کے تحت مشہور و معروف محقق، اسلامی اسکالر مولانا ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحب نے بڑے ہی سادہ اور باوقار انداز میں (جامعۃ الفلاح کا نمونہ) پیش کیا ہے۔ موصوف اس ادارے کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی ہیں۔ محترم نے اپنے اس مختصر سے پیغام نما مضمون میں ہم نصابی سرگرمیوں کے سلسلے میں جامعۃ الفلاح کی کوششوں کا اشارتاً ذکر کرتے ہوئے اُنھیں قابل قدر مانا ہے اور دوسرے مدارس کے ذمہ داران کو اس نمونے کو اپنانے کا مشورہ دیا ہے۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے سکریٹری مولانا انعام اللہ فلاحی صاحب نے اپنے مضمون کے ذیل میں مسابقتی پروگراموں کے انعقاد، سیر و سیاحت، جسمانی ورزش، توسیعی خطبات، سلیقہ و شائستگی، قلمی رسائل، شجر کاری، معلوماتی مقابلے، طلبہ کی لائبریری وغیرہ کو ''ہم نصابی سرگرمیوں کے زمرے میں شامل کیا ہے اور اس کے فوائد میں خوابیدہ صلاحیتوں کی آبیاری، مافی الضمیر کے اظہار، تحریر و مضمون نویسی، قائدانہ صلاحیت اور احساس ذمہ داری کا شعور بیدار ہونے کو شمار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام کام اگرچہ تقریباً ان تمام دینی درس گاہوں میں ہوتے ہیں جو تعلیم کے ساتھ اقامت و تربیت کا بھی انتظام کرتی ہیں لیکن ان میں یہ کام طلبہ اپنے طور پر، ضلعی و صوبائی سطحوں پر انجام دیتے ہیں۔ انہیں کاموں کو اگر ادارہ کی سطح پر انجام دیا جائے تو اس کے بہت سے فوائد سامنے آ سکتے ہیں اور وہ طلبہ بھی ان سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں جو درسی کتاب کے علاوہ کسی دوسری سرگرمی کو ''شجرِ ممنوعہ'' سمجھتے ہیں۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں ایک نیا تجربہ ''جامعۃ الحکمہ بھوپال'' کے بانی محمد محفوظ خاں فلاحی صاحب کا ہے جنھوں نے دینی و عصری جامعات میں پائی جانے والی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے ہوئے

بھوپال میں با قاعدہ ایک ایسے ادارے کی داغ بیل ڈالی ہے۔موصوف کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ''جدید صالح'' اور''قدیم نافع'' کے اصول پر گامزن ہوتے ہوئے موصوف نے تدریس کے لیے ''تعلیم کے اوقات کی تحدید'' درجہ وائز متعینہ نصاب جس کے لیے ذریعہ تعلیم اردو وعربی کے ساتھ انگلش میڈیم اسکول کی شکل میں ایک چیلنج مان کر قبول کیا ہے۔اسی وجہ سے موجودہ زمانوں سے ہم آہنگ ہونے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی دینی درس گاہ وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہیں جو عصری درس گاہوں میں بھی ممتاز ہو یا بصورتِ دیگر ایسی عصری درس گاہ ہو جس میں طالب علم اپنی دینی بنیادوں اور مذہبی تشخص پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ کر زمانے کے ساتھ چلنے والا ہو۔اللہ کرے موصوف اپنی اس کوشش میں بہرصورت کامیاب ہوں اور یہ ادارہ دوسروں کے لیے ایک مثالی ادارہ بن سکے۔

پروفیسر عبیداللہ فہد صاحب کا مضمون بایں طور اچھوتا شمار ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنے دورِ طالب علمی (۱۹۷۱ءتا۱۹۸۰ء) میں جامعۃ الفلاح کے نظام تعلیم وتربیت پر بڑے ہی مؤثر انداز سے روشنی ڈالی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سے چار دہائی قبل تک اساتذہ اور طلبہ میں کس انداز کے تعلقات تھے؟ وہ ایک طالب علم کو بہترین طالب علم بنانے کے لیے کتنی قربانیاں دیتے تھے؟ طرفین کے یہ رشتے گھریلو تربیت سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔اسی کے نتیجے میں جس انداز کے طالب علم نکلتے تھے وہ ''چندے آفتاب'' و''چندے ماہتاب'' ہونے کے ساتھ ساتھ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا نمونہ پیش کرتے تھے۔اگرچہ زمانے کی دیکھا دیکھی اب ان رشتوں میں قدرے کمزوری تو آ گئی ہے لیکن دینی مدارس ابھی بھی اپنی حدود میں اس نظامِ تربیت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں جن میں جامعۃ الفلاح بطور خاص قابل ذکر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی صاحب سابق ڈین فیکلٹی آف دینیات وسابق چیرمین وناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے مضمون ''مدارس میں داعیانہ تربیت کا غیر تدریسی نظام'' میں جن نکات کو بطور خاص ابھارا ہے ان کو اگرچہ صرف جامعۃ الفلاح کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ تمام دینی مدارس کو ایسے فضلاء وعلماء کی جماعت تیار کرنے کا مشورہ دیا ہے جن کا اخلاق وکردار بھی اعلیٰ سطح کا ہو اور وہ علم وعمل کے بھی مجسم پیکر ہوں۔وہ ''بنیادی مصادر کی مدد سے اسلام کی صحیح شبیہ پیش کرنے کا فریضہ کل وقتی طور پر انجام دینے کے ساتھ ساتھ تقابلی مطالعہ ادیان ومذاہب کے مروج ماحول اور خوشگوار فضا

کا سہارا لیتے ہوئے دوسری تہذیبوں اور تقاضوں کے کڑوے اور کسیلے پن کو بھی طشت از بام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرسکیں‘‘۔اس ضمن میں آپ نے بہت سے مفید مشورے دیے ہیں جنھیں ان کی فکری صلاحیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے،لیکن جہاں تک علمی دنیا کا تعلق ہے اس میں یہ بایں طور ناممکن الوقوع ہے کہ جدید تہذیب کی مرعوبیت نے ہم سے حق گوئی وصداقت کے جواہر چھین لیے ہیں،ان کی جگہ مفاد پرستی،خودغرضی نے لے لی ہے جس کے لیے آئیڈیل دینی مسلمان بھی اپنا ضمیر تو کیا مذہب کی تجارت کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔مضمون واقعتاً بہت قیمتی ہے۔مشورے اور نصیحتیں بہت قیمتی ہیں۔

جامعۃ الفلاح کے استاذ ذکی الرحمٰن غازی صاحب کا مضمون ’’تعلیم وتربیت کے چند اصول‘‘ (سیرت پاک کے حوالے سے) بہت اچھا اور متوازن مضمون ہے جس میں مضمون نگار نے عنوان کی مناسبت سے دس اصول گنا کر’تلک عشرۃ کاملۃ‘‘ کو واضح کردیا ہے۔اس میں موصوف نے جن اصولوں کو بیان کیا ہے وہ دینی مدارس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کامیاب ونفع بخش زندگی گزارنے کے لیے کارآمد اصول ہیں جنھیں اپنانے کی ضرورت موجودہ معاشرے میں شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ محترم نے اپنے مضمون میں ہر اصول کے لیے قرآن وحدیث سے دلائل فراہم کرکے اسے مستند بنادیا ہے جس کے لیے وہ لائق مبارک باد ہیں۔

ماہنامہ حجاب اسلامی کے مدیر شمشاد حسین فلاحی صاحب کے مضمون ’’مدارس کا مطلوبہ نظامِ تعلیم وتربیت‘‘ میں جن نکات کو ابھارا گیا ہے وہ بہر طور قابل غور ہیں۔اساتذہ طلبہ پر اپنی شخصیت کی چھاپ چھوڑتے ہیں اگر وہ اپنی روش کو درست نہیں رکھیں گے، اپنے اخلاق کو بلند نہیں کریں گے، اپنی ترجیحات میں ایثار کا نمونہ پیش نہیں کریں گے تو اُن کے زیر اثر طلبہ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ معاشرے کے مثالی فرد بن سکیں۔اِلا ماشاءاللہ۔

نوراللہ خاں فلاحی صاحب نے فارغین مدارس کے لیے حکومتی اسکیموں کا تعارف کراتے ہوئے ان سے استفادے کی شکلیں بھی بتائی ہیں۔اگرچہ یہ مدارس کے بنیادی مزاج کے خلاف ہے۔لیکن موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان سے فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والے فضلاء وفارغین کے لیے بہت سی اسکیمیں ہیں۔

امتیاز وحید فلاحی صاحب کے مضمون میں اُن یادوں کے نقوش واضح ہوتے ہیں جو جامعۃ الفلاح

میں زمانہ طالب علمی میں اُن کے ذہن پر مرتسم ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں بہت سے احباب کا تذکرہ اسے ''ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا'' کی صدائے بازگشت کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ اس میں اُس وقت کے بہت سے جسمانی و ذہنی کھیلوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ مضمون نگار اگر اپنے زمانے کا وقت بھی متعین کر دیتے تو یہ سمجھنے میں آسانی رہتی کہ کتنے سالوں بعد یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

اس کے بعد مضامین ''مولانا محمد عیسیٰ قاسمی کی درخشاں خدمات'' (محمد افضل فلاحی)، ''ایک تاریخی رپورتاژ'' (ظفر احمد الاثری فلاحی)، ''بزمِ ادب''، ''جامعہ کے لیل ونہار'' اور ''اخبار انجمن''، اشاعت خاص کے زمرے میں نہیں آتے لیکن معلوماتی اور مفید ہیں۔

آخیر میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہندوستان میں قائم دینی مدارس کا بنیادی مقصد اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس کے لیے تمام محنت اور جدو جہد کی جاتی ہے۔ ان مدارس میں تعلیم و تربیت کا محور یہی دو عناصر ہیں جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی، سنن ونوافل و مستحبات پر مداومت، اخلاقِ عالیہ، اوصاف حمیدہ، تبلیغ دین، فہم قرآن وحدیث، فقہی نکات، ادبی نگارشات سب کچھ اس کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان دینی مدارس و جامعات کے قیام کا مقصد حقیقی حصول فلاح آخرت ہے۔ اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بہر حال اس اشاعت خاص پر ''حیاتِ نو'' کی منتظمہ کو مکرر مبارک باد۔

●▭●

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب کے استدراک کی وضاحت (مدیر اعزازی)

محترمی ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب ہندوستان کے عظیم ادارہ دار العلوم دیوبند کی فکر کے ترجمان ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف ''دیوبند: تاریخ و تہذیب کے آئینے میں'' اس ضمن میں چشم کشا ہے۔ میری درخواست پر انھوں نے اپنا نہایت قیمتی وقت نکال کر اشاعت خاص پر وقیع تبصرہ فرمایا۔ ادارہ آپ کی خدمت کا ممنونیت کے ساتھ اعتراف کرتا ہے۔ برادر گرامی نے خاکسار راقم کے اداریہ پر تبصرہ فرمایا ہے جو ان کا حق بھی ہے کہ اس نے مدارس کے تربیتی نظام کو ناقص کہہ دیا لہٰذا اسے اپنی رائے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

پہلی بات یہ عرض کرنا ہے کہ دنیا کے کسی مدرسے یا دانش گاہ کا نظام تعلیم و تربیت نقص وقصور سے

خالی نہیں ہوسکتا۔

تاہم اسی تربیتی نظام سے گزر کر کچھ لائق وفائق طلبہ پیدا ہوسکتے ہیں اور ہورہے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر دور میں صاحب کمال ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ جب مدارس کا نظام نہیں تھا تب بھی الحمدللہ ارباب بسط وکشاد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ راقم نے اکثر مدارس کے تعلیمی وتربیتی نظام کو''ناقص''، اس معنی میں لکھا ہے کہ عموماً مدارس میں تدریسی نظام کے ساتھ''غیر تدریسی/ ہم نصابی سرگرمیوں'' کو تربیت کے لیے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے چنانچہ اس کی نگاہ میں یہ بہت بڑا نقص ہے۔ مدارس میں جو مخصوص نظام ونصاب تعلیم جاری وساری ہے وہ بہر حال اصلاح کا طالب ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر عبید اقبال قاسمی صاحب نے جیسا کہ خود مدارس میں اصلاح کی خواہش کا اظہار کیا ہے وہ عملاً اسی مہم میں لگے ہوئے بھی ہیں۔ البتہ مدارس کے اندر کمیوں اور کوتاہیوں کے لیے ناقص کا لفظ استعمال کرنے کے روادار نہیں ہے۔ دیانت داری کے خلاف اسے علمی تصور کرتے ہیں۔ راقم کو ان سے بوجوہ اتفاق نہیں ہے۔ مدارس کے تعلیمی وتربیتی نظام ونصاب کے لیے''ناقص'' کا لفظ استعمال کرنے پر علمی بددیانتی کا الزام ہرگز نہیں لگایا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر مدارس میں جاری نصاب میں ہم نصابی سرگرمیوں سے یکسر بے التفاتی برتی گئی ہے۔ راقم کے نزدیک یہی ان مدارس کا ناقص تعلیمی وتربیتی نظام ہے جن کی اصلاح کے نتیجے میں بے شمار فوائد وبرکات کی توقع کی جاسکتی ہے۔

حاشا وکلا اس تبصرہ کے ذریعہ مدارس اسلامیہ کی خدمات عالیہ کا عدم اعتراف ہرگز مقصود نہیں ہے۔ مدیر کا مدعا بس یہ ہے کہ اہل مدارس کو نصابی اور ہم نصابی کورس میں توازن پیدا کرنا چاہیے اور جہاں یک رخا پن ہے، اپنے نقص کا ادراک کرنا چاہیے۔ راقم صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ تدریس اور تربیت کے مابین جو لزوم ہے ہم نصابی سرگرمیاں اس کو مزید پختگی، اور استحکام بخشیں گی اور جبھی امید کی جاسکتی ہے کہ نقص، کوتاہی اور قصور کو کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ محترمی تبصرہ نگار کا لفظی وحرفی تعاقب شاید رفع ہوجائے اگر مدیر راقم لفظ''ناقص'' کی جگہ''نامکمل'' کا بھی اضافہ کردے۔ بہر کیف ہم صمیم قلب سے مولانا ڈاکٹر عبید اقبال قاسمی صاحب کے مشکور ہیں۔

اشاعت خاص پر ایک نظر

رضوان احمد فلاحی

انجمن طلبہ قدیم، جامعۃ الفلاح کے ماہانہ ترجمان 'حیات نو' کا شمارہ برائے اگست وستمبر ۲۰۱۹ سامنے ہے۔ یہ اشاعت خاص ہے اور اس کا موضوع ہے 'مدارس اسلامیہ کی ہم نصابی سرگرمیاں'۔ مجلّے کے موجودہ مدیر ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی کی ادارت میں منظر عام پر آنے والا یہ پہلا خصوصی شمارہ ہے۔ اس سے قبل اس کے سابق مدیر ابوالاعلیٰ سید سبحانی اپنے زمانہ ادارت میں چند خصوصی شمارے کامیابی سے شائع کر چکے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی سال میں کم از کم ایک بار خصوصی موضوعاتی شماروں کی اشاعت کا اہتمام رہے گا۔

جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے، اشاعت خاص میں اس پہلو کو اجاگر کرنے اور اس کی اہمیت وافادیت کو نمایاں کرنے پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ کے ہمہ جہتی ارتقا کے لیے نصابی تعلیم کے پہلو بہ پہلو غیر نصابی، لیکن روح نصاب سے ہم آہنگ، سرگرمیوں میں ان کی بھرپور شمولیت ان شاءاللہ نفع بخش ثابت ہوگی۔

پانچ صفحوں پر مشتمل اداریہ کا تقریباً نصف حصہ معروف ماہر تعلیم جناب افضل حسینؒ کی مشہور زمانہ تصنیف 'فن تعلیم وتربیت' سے لیے گئے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ اقتباسات کا انتخاب برمحل ہے۔ لیکن زیادہ بہتر ہوتا کہ مزید متعلق اقتباسات کا اضافہ کر کے انہیں ایک الگ اور مستقل مضمون کی شکل دی جاتی۔ تاہم مدیر نے ان کی مدد سے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ ان کی گفتگو ایجابی انداز سے غور وفکر پر آمادہ کرتی ہے۔

اشاعت خاص کے لیے بڑے عرصے سے اہل قلم کو اس موضوع پر لکھنے کی دعوت دی جاتی رہی۔ لیکن مجلّے کے مندرجات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع سے راست بحث کرنے والے

مضامین بہت کم ہیں، صرف دو۔ ایک ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کا جنھوں نے جامعۃ الفلاح کے سال بھر کے ہم نصابی پروگرام کا تحسینی تعارف پیش کیا ہے۔ راقم الحروف پہلی بار اس سے متعارف ہوا۔ بہتر ہوتا کہ پورا پروگرام ایک ضمیمے کے طور پر مجلّے میں بھی شائع کر دیا جاتا۔ دوسرا مضمون جس میں موضوع سے انصاف کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جناب انعام اللہ فلاحی کا ہے۔ انہوں نے بڑی حد تک غیر نصابی سرگرمیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے گو کہ فہرست میں مزید کی گنجائش کا امکان موجود ہے۔

مجلّے میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن کا، اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود، موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور جن کے بارے میں خیال کیا جاسکتا ہے کہ ان کی موجودہ شمارے میں شمولیت مدیر کے جذبۂ رواداری کا مظہر ہے۔ بہرحال یہ مضامین افادیت سے خالی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر عبید اللہ فہد نے جامعۃ الفلاح میں اپنے پہلے روز سے آخری دن تک کی روداد حیات بیان کرتے ہوئے کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ، جامعہ کے نظام تربیت کی خوب وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں خود ان کی اپنی ہم نصابی سرگرمیوں کا عالمانہ بیانیہ نہ صرف نو واردان بلکہ مجھ جیسے پیشرووں کے حوصلوں کو بھی مہمیز کرتا ہے۔ بلکہ اب تو وہ اپنے متعدد سینئروں سے بھی سینئر ہیں۔ ان کی کامیابیاں صرف ان کے لیے ہی نہیں، پوری فلاحی برادری کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ صفحہ ۳۹ پر موصوف نے لکھا ہے کہ پندرہ روزہ الدعوۃ کے مدیر مولانا سید سلمان ندوی تھے۔ موصوف کو تسامح ہوگیا ہے۔ مولانا سلمان ندویؒ کا تعلق ضلع اعظم گڑھ میں راجپوتوں کی ایک بستی 'سکھولا' سے تھا۔ یہ بستی میرے آبائی گاؤں سیدھا سلطان پور کے قریب واقع ہے۔ مولانا کو کم عمری ہی میں ہدایت کی دولت نصیب ہوگئی تھی۔ مرحوم ندوۃ العلماء کے ان طالب علموں میں سے تھے جنھوں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی شہرہ آفاق تصنیف 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' کے مسودے کی تبییض کی تھی۔ مرحوم کی سرپرستی میں مجھے 'الدعوۃ' میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میرے علاوہ شبیر فلاحی صاحب، طارق اکرام اللہ فلاحی اور افکار فلاحی نے بھی کام کیا ہے۔

ڈاکٹر امتیاز وحید نے تو کھیل کا میدان سجایا اور خوب سجایا۔ ان کے شگفتہ ادبی اسلوب کا سحر قاری کو کھیل کے میدان میں لا کھڑا کرتا ہے۔ کہیں کہیں ان کا انداز رننگ کمنٹری دینے کا سا نظر آتا ہے۔ ان کا نکتہ بحث یہ ہے کہ دینی اداروں میں کھیلوں کا وسائل کی حد تک پورا نظم ہونا چاہیے۔ مضمون نگار نے

بظاہر کھیلوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن گہرائی میں اتریے تو وہ کھیلوں کو طلبہ کی ذہنی اور جسمانی بہتری کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہوئے انہیں غیر نصابی سرگرمیوں کا ضروری جزو قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں مارشل آرٹ کو بھی غیر نصابی سرگرمیوں کا لازمی حصہ بنانا ضروری ہے۔ ماضی قریب تک بنوٹ کا فن لوگ سیکھتے تھے۔ وہ بھی مارشل آرٹ ہے۔ ڈاکٹر فہد نے اختصار سے اور ڈاکٹر امتیاز نے تفصیل سے اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ دونوں کی تحریروں کو پڑھتے وقت راقم نے خود کو جامعہ کے کیمپس میں گھومتا پھرتا محسوس کیا۔

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی اور شمشاد حسین فلاحی کی فاضلانہ تحریریں موضوع سے براہ راست متعلق نہ ہوتے ہوئے محض جزوی طور پر اس سے بحث کرتی ہیں۔ ذکی الرحمٰن غازی کا مضمون مدلل اور پرمغز ہے۔ تاہم موضوع سے اس کا بھی کوئی راست تعلق نہیں ہے۔ یہی بات محمد محفوظ خاں فلاحی اور محترم ظفر اثری صاحب کے مضامین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ اول الذکر کا انداز کسی مجلس میں کی گئی تقریر یا پڑھی گئی تحریر کا تاثر دیتا ہے۔ ثانی الذکر کے مضمون کی بدولت بہت سی تاریخی باتیں ریکارڈ ہوگئی ہیں جس پر ان کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔

اخیر میں ایک درخواست جامعہ کی خبریں کے مرتب جناب مصباح الباری صاحب سے ہے کہ اگر جامعہ میں آئے کسی مہمان شخصیت کا ذکر خبروں میں ہو تو گزارش ہے کہ نام کے ساتھ چند تعارفی الفاظ بھی درج کر دیے جائیں۔ وہ شخصیت اہل جامعہ کے لیے معروف ہوسکتی ہے لیکن حیات نو کے ہر قاری کے لیے نہیں۔ موجودہ شمارے میں مولانا مبشر عالم ندوی صاحب کے بارے میں خبر شائع ہوئی ہے۔ میری طرح بہت سے لوگ ان سے ناواقف ہوں گے۔ چند لفظی تعارف ناواقفیت کو واقفیت میں بدل سکتا ہے۔

مجلّے میں شامل مضامین کا انداز علمی اور معیار اعلیٰ ہے۔ البتہ پروف خوانی مناسب انداز سے نہ ہوسکی۔ ایک جگہ 'شیشہ دل پر بال' استعمال ہوا ہے۔ صحیح محاورہ ہے شیشۂ دل میں بال آنا۔ بہر حال ان سلوٹوں سے قطع نظر، مضامین قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہیں۔

●●

خصوصی شمارہ: ایک نظر میں

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی!

مدیر اعزازی ماہنامہ جریدہ حیات نو

تازہ شمارہ اگست۔ستمبر ۲۰۱۹ء باصرہ نواز ہوا۔ مدارس اسلامیہ کی ہم نصابی سرگرمیوں پر ایک منفرد خصوصی اشاعت کی جمع وترتیب پر مبارک باد قبول کریں۔ استاد گرامی مولانا ظفر احمد اثری کی رپورتاژ انجمن طلبہ قدیم کی تاریخ مرتب کرنے میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ حیرت ہے کہ فاضل مضمون نگار نے وہ تمام مکاتیب، یادداشتیں محفوظ رکھی ہیں۔ ''بزم فلاح'' کے قیام کے پس منظر سے شاید استاد گرامی واقف نہیں کیوں کہ وہ ان سرگرمیوں میں عملی طور سے شامل نہ تھے اسی لئے وہ تفصیلات مضمون میں نہ آسکی ہیں۔ میں جلد ہی اس پس منظر کی تفصیل پر لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس کی شہادت مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی دیں گے لیکن اس وقت خط لکھنے کا محرک ڈاکٹر امتیاز وحید کی تحریر ہے جس کا عنوان ہے:

تربیت اور کھیل کا دفتر کُھلا!

آج نماز جمعہ سے قبل میں نے اس مضمون کی ورق گردانی شروع کی تو احساس ہوا کہ حرف حرف پڑھنا چاہئے کیوں کہ اس کی اہمیت فلاحیوں کے لئے مختار مسعود کی ''حرف شوق'' سے کسی درجہ کم نہیں ہے۔ میں اس مضمون میں اس درجہ کھو گیا کہ خطبہ جمعہ چھوٹ گیا اور بمشکل نماز مل سکی۔ اس تحریر کی خوبی اس کی ادبیت، تاثیر اور دل کشی ہی نہیں، اس کا امتیاز وہ فکری ومعنوی نظام ہے جس میں کھیل کود کی سرگرمی اپنی جگہ بناتی ہے، اسلام کے مجموعی نظام فکر وعمل میں صحت مند جسم کی نشو ونما پر وہ موزوں اور متناسب زور ہے جس سے اس مضمون کی جگہ فکر اسلامی کی فہرست میں اپنے آپ متعین ہو جاتی ہے۔ درمیان میں حسِ مزاح کی آمیزش ہے، آیات واحادیث کے حوالے ہیں، اور ہندوستانی کھیلوں کی

تاریخ کی طرف اشارے بھی۔ کہیں کہیں نظام جامعہ پر تنقید بھی ہے مگر اس پر محبت وعقیدت کے سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے اور تنقیص کا ادنیٰ تاثر بھی پیدا نہیں ہوتا۔

راقم نے اس سے پہلے امتیاز وحید کی دو تحریریں پڑھی ہیں: جامعہ کا نظام مطبخ اور ترانۂ جامعہ۔ اور اب یہ تیسری تحریر کھیل پر۔ یہ تینوں تحریریں بلاغت اور ادب کا شاہ کار ہیں۔ حیرت ہوتی ہے اور اس سے زیادہ مسرت کہ جامعۃ الفلاح نے کیسے کیسے گوہر نایاب ملت کی جھولی میں ڈالے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ انہیں نظر بد سے بچائے۔ گردش زمانہ کی کلفتوں سے محفوظ رکھے اور ان کے قلم کی شادابی وتاثیر میں اضافہ کرے۔

ان مضامین کے موضوعات وہ ہیں جو عام طور سے نظر انداز کردیے جاتے ہیں مگر ہم نصابی سرگرمیوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف کے قلم نے ساحری کی ہے اور ان موضوعات کو بڑا دلچسپ اور فکر انگیز بنادیا ہے۔ کاش ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا کوئی بندوبست ہو اور امتیاز وحید کے یگانہ امتیازات کو خراج پیش کیا جاسکے۔ جی چاہتا ہے کہ مصنف سے روبرو گفتگو ہو اور ان کی تمام تحریریں مطالعہ میں آئیں۔

والسلام

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی

پروفیسر وصدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز (اے ایم یو، علی گڑھ)

۱۵/نومبر ۲۰۱۹ء

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی

جدید اسلامی فکر۔ایک تنقیدی جائزہ، کا اجرا

۱۲/ستمبر ۲۰۱۹ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں جناب مولانا ذکی الرحمٰن غازی مدنی کی کتاب 'جدید اسلامی فکر ایک تنقیدی جائزہ' کا اجرا ہوا۔ اس کتاب کا تعارف جناب مولانا عبدالرحمٰن ندوی صاحب نے کراتے ہوئے فرمایا کہ اس کتاب میں منہج اہل سنت والجماعت اور منہج اہل بدعت کو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری ازخود سمجھ لے کہ کون کس حد تک سلف صالح کے نہج پر گامزن ہے۔ اس کتاب میں جدید اسلامی فکر کا تعارف اور اس میں پائے جانے والے فکری انحرافات پر گرفت کرتے ہوئے اہل سنت والجماعت کا موقف مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔ جدید مفکرین نے جدید مسائل میں جہاں ٹھوکر کھائی ہے یا اہل سنت کے موقف ومنہج میں کتر وبیونت کر کے اسے مغربی ثقافت وتمدن کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے یا مختلف سطحوں پر اجتہاد واستنباط کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کتاب میں ان سب کا جائزہ فکری تلبیسات کی سرخی کے تحت لیا گیا ہے۔

'اسلامی فرقے' کا اجرا

۱۴/ستمبر ۲۰۱۹ء بروز شنبہ ابواللیث ہال میں صدر مدرس ومعاون مہتمم جناب مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صاحب کی ایک اہم علمی نئی کاوش 'اسلامی فرقے' کا اجرا ہوا۔ کتاب کا تعارف جامعہ کے فاضل استاد جناب مولانا ذکی الرحمٰن غازی ندوی مدنی صاحب نے پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ صدر اول سے لے کر اب تک سیاسی، عقائدی اور کلامی اعتبار سے یہ امت جتنے فرقوں میں تقسیم ہوئی وہ سب کے سب موجود ہیں۔ اہل بدعت کے افکار کی تردید ایک قسم کا جہاد ہے۔ مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صاحب کی اسلامی فرقے نامی کتاب اردو زبان میں ایک اہم جامع کتاب ہے۔ اس کتاب میں معروضی انداز سے

فرقوں کے ظہور کے اسباب ان کے افکار وعقائد، اہم شخصیات، ائمہ اور علاقوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اور صحابہ کرامؓ کے تعلق سے مواقف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں بہت ہی جامع انداز میں یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔حوالہ جات کا خاص طور سے اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر مبحث کے اختتام پر مزید مطالعہ کے لیے کتابوں کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔فرقوں میں اہل سنت والجماعت کے امتیازات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔اس طرح فرقوں کے افراط وتفریط کے درمیان اہل سنت کی میانہ روی کو مثالوں کے ذریعہ آراستہ کرکے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مولانا اقبال احمد اصلاحی ندوی صاحب کی تذکیر

۱۴/اکتوبر ۲۰۱۹ء بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں جناب مولانا اقبال احمد اصلاحی ندوی صاحب کی ایک تذکیر بعنوان 'امتحان کی تیاری کیسے کریں؟' ہوئی۔

مولانا نے اپنی تذکیر میں فرمایا کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔طلبہ کو سال کے شروع ہی سے تمام مضامین کا نظام الاوقات بنالینا چاہیے اور اس پر تسلسل کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ہر مضمون کے آپ خود نوٹس تیار کرلیں تاکہ امتحان کے وقت آپ ان نوٹس پر نظر ڈال کر تمام باتیں ازبر کرسکیں۔تمام طلبہ کو تین چیزوں پر عمل کرنا چاہیے: (۱) کلاس میں جانے سے پہلے طلبہ خود مطالعہ کرکے جائیں، عبارت خود حل کرکے جائیں۔(۲) کلاس میں استاد کی بات خوب غور سے سنیں۔(۳) کلاس سے واپس آنے کے بعد پابندی کے ساتھ اعادہ اسباق کرنا چاہیے۔

اسی طرح طلبہ امتحان سے پہلے پرانے پرچے ضرور حل کرلیں تاکہ آپ کو سوالات کا نمونہ مل جائے اور اسی طرح امتحان ہال میں سب سے پہلے الاسھل فالاسھل پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے آسان سوالات حل کریں پھر مشکل سوالات کو حل کریں۔آخر میں امتحان ہال میں دس پندرہ منٹ بچالیں تاکہ آپ کاپی کا پھر اعادہ کرسکیں۔امتحانی سوالات کی کچھ اصطلاحات ہوتی ہیں۔ان اصطلاحات کو پہلے سے سمجھ لیں۔امتحان ہال میں جانے سے کچھ دیر پہلے کاپی کتاب اور نوٹس پڑھنا چھوڑ دیں تاکہ آپ کا ذہن فریش ہوجائے اور امتحان ہال جانے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لیں۔اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں صرف اپنی معلومات پر ہی اکتفا نہ کریں۔اپنے جوابات کو سجائیں۔کاٹ چھانٹ اور وائٹنر کے استعمال سے گریز کریں، ہر سوالات کے جوابات نئے صفحہ سے شروع کریں۔بہترین تحریر اور بہترین خوش خط لکھیں۔حاشیہ کا خاص خیال رکھیں، جواب نہ تو اتنا مختصر ہو کہ سمجھ میں ہی نہ آئے اور نہ ہی اتنا طویل

ہوجائے کہ ممتحن پڑھتے پڑھتے تھک جائے۔ دوسرے طالب علم سے کوئی جواب ہرگز نہ پوچھیں۔ بلکہ اپنے اوپر اعتماد کیجیے۔اور اپنی معلومات سے جوابات لکھیے۔امتحان ہال سے نکلنے کے بعد کبھی پچھلے پرچے کی تحقیق مت کیجیے ورنہ اگر آپ نے جواب غلط لکھا ہوگا تو ٹینشن کی وجہ سے اگلا پرچہ متاثر ہوگا۔ امتحان کے دوران اپنی صحت کا بھی خیال رکھیے۔اور کھانے پینے پر بھی توجہ دیجیے۔

اصل امتحان کی فکر کرنی چاہیے۔جس کے لیے آپ کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبرات سے کامیاب کرے۔آمین۔

جامعہ میں ششماہی امتحان

۲۰/اکتوبر ۲۰۱۹ء بروز یکشنبہ جامعہ میں ششماہی امتحان کا آغاز ہوا۔۳۱/اکتوبر ۲۰۱۹ء تک ششماہی امتحان جاری رہا۔۳۔نومبر ۲۰۱۹ء بروز شنبہ ششماہی ثانی کا آغاز ہوا اور تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے۔نومبر ۲۰۱۹ء کے آخر تک ششماہی امتحان کا رزلٹ آنے کی امید ہے۔

مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب کو صدمہ

اکتوبر ۲۰۱۹ء بروز جامعہ کے قدیم استاد و سابق مہتمم مولانا سلامت اللہ اصلاحی کی ہمشیرہ کا مختصر علالت کے بعد دہلی میں انتقال ہوگیا۔آپ کے بہنوئی ڈاکٹر شفیق احمد اصلاحی ہیں۔مرحومہ کو سانس لینے میں کافی تکلیف تھی۔مرحومہ مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب سے بڑی تھیں۔مرحومہ کے بیٹے انیس احمد فلاحی ہیں۔اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات کو بلند کرے۔انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔آمین۔

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحب کا خطاب

۳۱/اکتوبر ۲۰۱۹ء بروز پنجشنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں جناب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحب کا خطاب ہوا۔آپ نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ طلبہ اپنے اندر اخلاص پیدا کریں۔ ہر عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو۔ دوسری چیز یہ کہ آپ اپنے اندر اختصاص پیدا کریں۔اللہ کے رسولؐ نے ہر اس عمل کو پسند کیا ہے جس کو بہتر انداز میں کیا جائے۔تیسری چیز یہ کہ آپ ریاکاری سے بچیں۔دکھاوے اور شہرت کے لیے کوئی کام ہرگز نہ کریں اور چوتھی چیز یہ کہ آپ اپنے اندر نافعیت پیدا کریں۔دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے بنیں۔پانچویں چیز یہ ہے کہ آپ جامعہ

سے فراغت کے بعد اسلام کے ترجمان بنیں۔ اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور دنیا کے رنگ میں نہ رنگ جائیں۔ اور آخری چیز یہ ہے کہ آپ جامعہ کا مزاج اپنے اندر پیدا کریں۔ اپنی پہچان کے لیے آپ تحریکی بنیں۔ تحریک سے جڑیں اور تحریک کو میں بہت وسیع معنیٰ میں لے رہا ہوں۔ یعنی جو لوگ اس طرح کی کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں وہ سب اس تحریک کے مفہوم میں شامل ہیں۔

مولانا نے مذکورہ باتوں کو دلائل سے مزین کر کے تفصیل سے پیش کیا اور کچھ اپنے تجربات ومشاہدات اور آپ بیتی بھی بیان کی۔

نظامت کے فرائض جناب مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب نے انجام دیے۔

جامعہ کے الفلاح اسپتال میں آئی سی یو کا افتتاح

یکم نومبر ۲۰۱۹ء بروز جمعہ جامعہ کے کیمپس میں واقع الفلاح اسپتال میں آئی سی یو کا افتتاح بعد نماز جمعہ شیخ الجامعہ وسابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری صاحب نے کیا۔

اس موقع پر مولانا سید جلال الدین عمری صاحب نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام میں خدمت خلق کی بہت اہمیت ہے۔ اور اسی خدمت کے پیش نظر جامعۃ الفلاح کے کیمپس میں چند برس قبل الفلاح کے نام سے ایک اسپتال کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اللہ رب العزت کا بڑا کرم ہے کہ روز بروز اس اسپتال میں ترقی ہوتی جارہی ہے۔ اور اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی میں آئی سی یو کا قیام عمل میں آیا ہے اس سے لوگوں کو یقیناً فائدہ پہنچے گا۔

اس اسپتال میں مریضوں کے لیے اب پچاس بیڈ کی سہولت ہو چکی ہے۔ جن مریضوں کو علاج کے لیے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا اب ان کا علاج یہیں پر ہو سکے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اچھے سرجن کی خدمات بھی حاصل کی جا چکی ہیں۔ مختلف شعبہ جات کا اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ علاقے کے مریضوں کے لیے چوبیس گھنٹہ سہولیات میسر ہیں۔

انجمن ہاسٹل کی تعمیر مرحلہ بہ مرحلہ

JARIDA HAYAT-E-NAU RNI No: DELURD/2015/65862
October, November - 2019 Vol. IV Issue - X-XI

ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	دعوت اسلامی اور مدارس دینیہ	مقالات سمینار منعقدہ فروری 2005ء	100.00
۲	دینی مدارس اور ان کے مسائل	مقالات سمینار منعقدہ فروری 1988ء	75.00
۳	زندگیاں تابعین کی	ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا	80.00
۴	طوفان آرہا ہے (رجوع الی اللہ یا تباہی)	ڈاکٹر مجدی ہلالی	45.00
۵	فتح اور غلبے کا قرآنی تصور (اول)	مسیح الزماں فلاحی ندوی	100.00
۶	فتح اور غلبے کا قرآنی تصور (دوم)	مسیح الزماں فلاحی ندوی	120.00
۷	فتح اور غلبے کا قرآنی تصور (سوم)	مسیح الزماں فلاحی ندوی	200.00
۸	ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس	مقالات سمینار منعقدہ اکتوبر 1992ء	40.00
۹	نصرت اور غلبے کی بشارت کس کے لیے؟	ڈاکٹر مجدی ہلالی	100.00
۱۰	قرآن پر عمل	ابراہیم شمسی	10.00
۱۱	عورت تہذیب کے دوراہے پر	مولانا محمد ایوب اصلاحی	45.00
۱۲	شاہ راہ قرآن	خرم مراد	15.00
۱۳	اسلام کی اخلاقی تعلیمات	مولانا محمد ایوب اصلاحی	45.00
۱۴	مدارس اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی	70.00
۱۵	القراۃ الرشیدہ (اول)	عبدالفتاح صبری وعلی عمر	50.00
۱۶	اسلام ایک تنہا حل	ڈاکٹر مجدی ہلالی	160.00
۱۷	دین اور سیاست	علامہ یوسف القرضاوی	260.00

رابطہ کریں

ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ، یوپی۔276121
E-20 مدھر سندیش سنگم، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلائی دہلی۔110025
Email: jareedahayatenau@gmail.com